

## انغواء

## لاش کا قہقہہ

یہ بھی ممکن تھا کہ یہ واقعہ ہی نہ ہوتا.... یا ہو ہی جاتا.... وثوق سے نہیں کہا جاسکتا۔ آرکچو میں وہ ہنگامہ قطعی اتفاقیہ تھا۔ یعنی اگر یہ کہا جائے کہ ہنگامہ اسی لئے ہوا تھا کہ اسی کی آڑ میں کوئی اپنا کام کر جائے تو یہ بالکل بیکاری بات ہوگی۔ کیونکہ جس کی وجہ سے ہنگامہ ہوتا وہ خواہ مخواہ اپنی گردن کیوں پھنساتا۔ ویسے اسکی گردن ہر اعتبار سے بہت موٹی تھی۔ وہ خود بھی موٹا تھا۔ غیر معمولی طور پر موٹا اور اتنا ہی غیر معمولی طور پر لمبا بھی.... یعنی اس جلنے کا آدمی گرائڈیل احق قاسم کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔

ہنگامے کی وجہ بہت معمولی سی تھی۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ وہ قاسم کے لئے بھی معمولی ہی رہی ہو۔ ہوا یہ کہ نوجوان جوڑا اُس کی میز کے قریب ہی کی ایک میز پر آیا۔ قاسم بڑے انہماک سے کھانے پر ہاتھ صاف کر رہا تھا۔ اس کے سامنے متعدد پلیٹیں تھیں اور ایک خالی پلیٹ میں ہڈیوں کا اہرام تعمیر ہو رہا تھا۔ اُس کے دونوں ہاتھ شور بے سے بھرے ہوئے تھے۔ آنے والوں میں ایک انتہائی خوبصورت لڑکی تھی اور دوسرا ایک نوجوان مرد۔ مرد کو قاسم اچھی طرح پہچانتا تھا۔ یہ شہر کے ایک سرمایہ دار کا لڑکا تھا۔

غالباً وہ بھی قاسم سے واقف تھا۔ کیونکہ دونوں کا تعلق ایک ہی طبقے سے تھا۔

قاسم لڑکی کو نہیں پہچانتا تھا لیکن پہلی ہی نظر میں وہ اُسے بے حد پسند آئی کیونکہ حسین ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اچھی صحت بھی رکھتی تھی۔ وہ اس معیار پر پوری نہیں اترتی تھی جس کے لئے قاسم کی

(تیسرا حصہ)

”رومانی“ لغات میں صرف ایک ہی لفظ ہو سکتا تھا۔ ”نگڑی“ مگر.... پھر بھی اُس کے چہرے مہرے اور ذیل ڈول میں اتنی ہم آہنگی تھی کہ قاسم اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

لڑکی بھی اُسے دیکھ کر مسکرائی اور نوجوان آہستہ آہستہ اُس سے کچھ کہنے لگا۔ ساتھ ہی وہ قاسم نکلیوں سے دیکھتا بھی جا رہا تھا.... پھر اُن دونوں نے ایک ساتھ تہقہ لگایا۔

قاسم کو تاؤ آ گیا۔ کھلی ہوئی بات تھی۔ وہ قاسم کا مضحکہ اڑانا چاہتے تھے۔ اگر لڑکی تنہا ہوتی تو یہ کوئی بات نہیں تھی وہ قاسم کے گلے میں جوتیوں کے ہار بھی ڈال سکتی تھی۔ مگر وہ مرد.... وہ ”لوہا“ پنھا“ کیوں ہنسا تھا اُسے دیکھ کر۔ قاسم کا اسکر یو ڈھیلا ہو گیا اور دوسرے ہی لمحے میں شور بے کی قاب۔ اس نوجوان کے منہ پر پڑی.... اُس کے ساتھ بھی ایک لڑکی تھی اور کسی لڑکی کی موجودگی میں اُس کا ساتھ معمولی سی توہین بھی نہیں برداشت کر سکتا۔

اُس نے قاسم پر چھلانگ لگائی۔ کرسی ٹوٹنے کی جڑ چاہت ڈائینگ ہال میں گونج کر رہ گئی۔ لوہا چاروں طرف سے دوڑ پڑے۔ اس دوران میں قاسم اُسے میز پر اچھال چکا تھا۔ میز سمیت وہ دوسری طرف الٹ گیا۔

دفعۃً اُسی وقت پورا ہال تاریک ہو گیا۔

کسی لڑکی کی چیخ اندھیرے میں لہرائی۔

”چھوڑ دو.... چھوڑ دو.... چھوپ۔“ ایسا معلوم ہوا جیسے اُس کا منہ دبایا گیا ہو۔ میزیں الٹ تھیں۔ لوگ چیخ رہے تھے اور قاسم بُری طرح بدحواس ہو گیا تھا.... نہ جانے کتنے بھاگتے ہوئے لوہا اُس سے ٹکرائے۔ نہ جانے وہ کتنی بار گرا۔ گر کر اٹھنے نہیں پایا کہ دو چار اور آگرے اُس پر۔ ظاہر۔ جب وہ دوبارہ اٹھ کر بھاگتے ہوں گے تو قاسم کا کیا حشر ہوا ہوگا۔ بہر حال وہ بُری طرح کچلا اور۔ گیا۔ لیکن اُسی بدحواسی کے عالم میں نہ جانے کیسے اُس کے ذہن کی دلدل میں روشنی کی ایک لودے اٹھی۔ اُس نے سوچا کہ اس ہنگامے کی ساری ذمہ داری اُسی پر عائد ہوگی۔ لہذا روشنی ہونے۔ قبل ہی کھسک جانا چاہئے۔

وہ بمشکل تمام اٹھا اور اندازے سے ایک دروازے کی سمت بڑھنے لگا۔

اندھیرے میں اب بھی لوگ ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ میزوں اور کرسیوں سے الجھ رہے تھے۔ برتنوں کے ٹوٹنے کی آوازیں نسوانی چیخوں سے ہم آہنگ ہو کر کچھ عجیب سی لگتیں۔

قاسم کسی نہ کسی طرح دروازے تک پہنچ گیا لیکن باہر نکلتا آسان کام نہیں تھا کیونکہ اب باہر سے بھی ایک جم غفیر اندر گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”ہزار خرابی وہ کہاؤں تک پہنچ گیا۔ پھر اُسے یاد نہیں کہ وہ کس طرح اپنی کار میں بیٹھا تھا اور کس طرح اُسے ڈرائیو کرنا ہوا گھر تک پہنچا تھا۔“

اُس کے کپڑے شور بے کے بڑے بڑے دھبوں سے زعفران زار بنے ہوئے تھے۔ ننھی منی بیوی نے اس کی ہیبت دیکھی اور کھکھلا کر ہنس پڑی۔

”کیا کسی نے باورچی خانے میں بند کر کے مارا تھا۔“ اُس نے ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا اور قاسم تانچ گیا۔

”دیکھو۔“ وہ انگلی اٹھا کر آنکھیں نکالتا ہوا بولا۔ ”تم مجھ سے بے تکلی باتیں نہ کیا کرو۔“

”تم تھے کہاں۔“ دفعۃً اُس کی بیوی کا موڈ بگڑ گیا۔ ”میرا خیال ہے کہ آج کسی شریف آدمی نے تمہیں اپنے گھر میں داخل ہوتے دیکھ لیا ہوگا۔“

”دب خ لیا تھا۔“ قاسم سر ہلا کر بولا۔ ”تم سے مطلب.... تم جہنم میں جاؤ۔“

”تم خود جاؤ.... مجھ سے اس طرح اکڑ کر گفتگو نہ کیا کرو۔ تمہاری لونڈی ہوں کیا۔“

”ہزار بار کہوں گا.... تم میری لونڈی ہو.... ہاں۔“

”زبان سنجال کے.... بڑے آئے.... کہیں کے۔“

”تم بکواس نہ کیا کرو.... کیا میں تم سے بولا تھا۔“ قاسم دہاڑا۔

”تمہیں بتانا پڑے گا کہ تم کہاں تھے۔“

”میں چائڈ خانے میں چرس پی رہا تھا۔ تم سے مطلب۔“

”میں ابھی چچا جان کو فون کرتی ہوں۔ پھر انہیں سے مطلب پوچھنا۔“

”کردو۔“ قاسم روم میں بولا۔ پھر یک بیک سنبھل کر ہکھلانے لگا۔ ”تم.... بب.... بیکار.... میرے

پپ.... پیچھے.... پپ پڑ رہی ہو.... میں تو میلاد میں گیا تھا.... ہاں۔“

”پھر یہ شور بے کے دھبے کیسے ہیں۔“

”میں نے میلاد سننے والوں کے لئے سالن پکایا تھا.... ارر.... ہام.... نن.... نہیں.... سنو تو سہی۔“

”تمہیں شرم نہیں آتی۔ خاندان کا نام اچھالتے پھرتے ہو۔“

”اب آئے گی.... اب آئے گی۔“ قاسم بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا۔

”تم اباجان کو فون مت کرنا.... ہاں.... مجھے ذرا غصہ آ گیا تھا۔“

”اور غصے میں تم نے قورے کی پلیٹ میں چھلانگ لگا دی۔“

”ارے تم سنو تو سہی.... مجھے اُس پر غصہ آ گیا تھا.... پرویز کے بچے پر۔“

”کون پرویز!۔“

”سر سلیمان کا لڑکا.... اُلو کا پٹھا.... مجھے دیکھ کر ہنستا ہے.... میں نے اُس کے منہ پر پلیٹ ماردی۔“

وہ لڑنے پر تیار ہوا تو اٹھا کر پھینک دیا سالے کو۔“

”کہاں لڑے تھے۔“

”آر لکچو میں۔“

قاسم کی بیوی نے ایک طویل سانس لی اور بولی۔ ”اب ہوگی مقدمہ بازی چچا جان اور سر سلیمان

میں ویسے ہی ٹھنی رہتی ہے۔“

”مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ ٹھنی رہتی ہے ورنہ ماری ڈالتا سالے کو۔“

”اپنی خیر مناؤ۔ چچا جان کو لازمی طور پر اس کا علم ہو جائے گا۔“

”اے چچا جان کی جتنی کبھی تم دونوں سے پیچھا بھی چھوٹے گا میرا۔“ قاسم جھلا گیا۔

”مجھے تم زہر دے دو۔ لیکن بوڑھے باپ کو کیوں کوڑتے ہو۔“

”دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔“ قاسم گلوگیر آواز میں بولا۔ ”ایک بھی باپ نہیں ہے.... اور....“

اور کوئی بھی نہیں ہے۔ یعنی کہ تمہیں کسی دن سچ سچ زہر دے دوں گا۔“

”کوشش کر کے دیکھو۔“ قاسم کی بیوی نے بُرا سامنہ بنایا۔

قاسم پیر پٹختا ہوا اپنی خواب گاہ کی طرف چلا گیا۔



شام ہی سے آسمان بادلوں سے ڈھکا رہا تھا۔ دس بجے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ آندھی اور

پانی ساتھ آئے تھے۔ شہر کے بہتیرے حصے بجلی کے تار ٹوٹ جانے کی بناء پر تاریک ہو گئے۔ سڑکیں

دیران پڑ گئی تھیں۔

دفعتاً ایک کار کرئل فریدی کی کمپاؤنڈ میں داخل ہوئی اور سیدھی پورچ کی طرف چلی گئی۔ کار۔

اڑنے والا حکمہ سراغ رسانی کا سپرنٹنڈنٹ تھا۔

نو کروں نے اُسے ڈرائیونگ روم میں بٹھا کر فریدی کو اطلاع دی اور فریدی شبِ خوابی کے لباس

ہی میں ملنے چلا آیا۔

”کیسے تکلیف فرمائی جناب۔“ فریدی نے حیرت سے کہا۔ وہ ایک با اصول آدمی تھا۔ اس لئے

اوپنی پوزیشن کا مالک ہونے کے باوجود بھی اپنے آفیسروں کا احترام کرتا تھا۔ پھر ویسے بھی سپرنٹنڈنٹ

ایک معمر آدمی تھا اور ابھی حال ہی میں کسی دوسری جگہ سے تبدیل ہو کر یہاں آیا تھا۔

”ایک نئی مصیبت کرئل....!“ سپرنٹنڈنٹ نے رک رک کر کہا۔

”فرمایئے....! تشریف رکھئے۔“ فریدی نے میز پر رکھی ہوئی گھٹی بجاتے ہوئے کہا۔

”میں نے فون کرنا چاہا لیکن لائن خراب تھی۔ میرے خدا.... اب تک اُسی رفتار سے بارش ہو رہی

ہے جس رفتار سے شروع ہوئی تھی۔“

اتنے میں ایک نوکر اندر آیا۔

”کافی....!“ فریدی نے اُس کی طرف مڑ کر کہا۔

”ارے نہیں بھی.... اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔

”آپ ٹھنڈی ہواؤں سے گزر کر یہاں تک آئے ہیں۔“ فریدی مسکرایا۔ ”کافی ضرور پیچھے۔“

”خیر.... ہاں.... تو میں اسلئے آیا تھا کہ اس طوفان میں شاید تمہیں گھر سے باہر نکلنا پڑے۔ مگر میں کیا

کروں۔ معاملہ اتنا ہی اہم ہے۔ کسی دوسرے کو اس معاملے میں ڈال کر وقت برباد کرنا مناسب نہیں سمجھا

گیا۔ سب سے پہلے میں آئی جی صاحب کے بنگلے پر گیا تھا۔ اُنکا بھی یہی خیال ہے کہ تم ہی کچھ کر سکو گے۔“

”فرمایئے.... موسم کی فکر نہ کیجئے.... موسم بھی اُسی جہانِ آب و گل کی پیداوار ہیں جس نے آدمی کو

جنم دیا ہے۔“

سپرنٹنڈنٹ چند لمحے اُس کے چہرے پر نظر جمائے رہا پھر بولا۔

”تم نے بھی سعیدہ رحمان کے متعلق سنا ہوگا۔“

”کون سعیدہ رحمان۔“

”جو ایک ہفتہ پہلے جیسے اینڈ بارٹلے کی فرم میں ٹائپسٹ تھی۔ لیکن اب ایک ارب پتی لڑکی ہے۔“

”مجھے افسوس ہے کہ میں نے اس معجزے کے متعلق ابھی تک کچھ نہیں سنا۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”ہاں معجزہ ہی کہا جاسکتا ہے۔ مجھے خود بھی حیرت ہے۔ اس قسم کے واقعات اور کردار صرف کہانیوں ہی میں ملا کرتے تھے۔ اُس کا ایک والد ار چچا حال ہی میں فوت ہوا ہے اور اس کی ساری دولت اُس کے حصے میں آئی ہے۔ لہذا یہاں کے سارے سرمایہ دار ایک بیک اُس کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔“

سپرٹنڈنٹ سانس لینے کے لئے رکا اور پھر بولا۔ ”آج شام کو وہ سرسلیمان کے لڑکے پرویز کے ساتھ آرگنچو میں تھی۔ وہاں خان بہادر عاصم کے لڑکے سے پرویز کا جھگڑا ہو گیا۔“

”جھگڑا کیوں ہو گیا۔“

”پرویز کا بیان ہے کہ اُس نے بس یونہی بیٹھے بیٹھے شور بے کی پلیٹ اُس کے منہ پر کھینچ ماری تھی۔ ان میں کوئی گفتگو بھی نہیں ہوئی تھی۔ پھر وہ دونوں ایک دوسرے سے الجھ پڑے۔ اسی دوران میں ہال فیوز اڑ گیا اور پرویز نے سعیدہ رحمان کی چٹیں سنیں۔ روشنی ہونے پر نہ وہاں سعیدہ تھی اور نہ قاسم۔ پرویز نے ہر وہ جگہ دیکھ ڈالی جہاں سعیدہ کے ملنے کے امکانات ہو سکتے تھے۔ لیکن وہ نہ ملی۔ سرسلیمان نے براہ راست آئی جی سے گفت و شنید کی ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ لڑکی کو اغوا کیا گیا ہے۔“

”شعبہ قاسم کی طرف ہو گا۔“ فریدی نے کہا۔

”ہاں یہی تو بات ہے۔ خان بہادر عاصم بھی آئی جی کے دوستوں میں سے ہیں۔ اسی لئے ہاں۔ عاصم اور سلیمان کے تعلقات پہلے ہی سے ناخوشگوار ہیں۔“

”میں سمجھ گیا۔“ فریدی سر ہلا کر بولا۔ ”لیکن اگر آپ یہ کام مجھے سونپنا چاہتے ہیں تو میں غور کروں۔“ فریدی جملہ پورا نہیں کر پایا تھا کہ کافی آگئی۔

”ہاں..... کہو..... کیا کہہ رہے تھے۔“ سپرٹنڈنٹ نے کہا۔

”مطلب یہ کہ اگر یہ واقعی اغواء کا کیس ہے اور اس میں قاسم ہی کا ہاتھ ثابت ہوا تو آئی جی صاحب کی دوستی عاصم کے کام نہ آسکے گی۔“

”میں سمجھتا ہوں۔ آئی جی صاحب بھی سمجھتے ہیں۔ اسی لئے وہ چاہتے ہیں کہ تفتیش تم ہی کرو۔ ان کا خیال ہے کہ عاصم کا لڑکا اس قسم کی حرکتوں کی صلاحیت نہیں رکھتا۔“

فریدی نے کافی بنا کر بیالی اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میں قاسم سے اچھی طرح واقف ہوں..... دوسروں کا آلہ کار بننے کی صلاحیت اُس میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ خیر میں دیکھوں گا.....“

اب آپ مجھے اُس لڑکی کے متعلق بتائیے۔ اُس کا چچا کہاں تھا۔“

”جیسا میں..... وہ وہیں پر آباد ہو گیا تھا۔ وہاں اُس کا کروڑوں روپیوں کا کاروبار تھا۔ اور لاکھوں کی جائیداد۔ اُس کی وارث یہی لڑکی سعیدہ رحمان قرار پائی ہے کیونکہ قریبی عزیزوں میں اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ اُسے یہ اطلاع یہاں کے ایک وکیل کی وساطت سے ملی تھی اور حیرت تو اس بات پر ہے کہ لڑکی کو اس کا علم نہیں تھا کہ اُس کا کوئی چچا اتنا مالدار بھی ہو سکتا ہے۔ ویسے اس کا بیان ہے کہ اُس کا ایک چچا تھا جو بچپن میں گھر سے نکل گیا تھا۔“

”اوہ..... یہ واقعی کوئی دلچسپ کہانی معلوم ہوتی ہے۔“ فریدی مسکرایا۔

”ہاں بھی! بعض اوقات تو اس لڑکی کے مقدر پر رشک آنے لگتا ہے۔“

”اُس کے چچا کا کیا نام تھا۔“

”کرم رحمان۔“ سپرٹنڈنٹ بولا۔ ”نچلے طبقے کے لوگ ہیں لیکن..... ذلت..... لڑکی کے والدین بھی مر چکے ہیں۔ وہ تعلیم یافتہ ہے۔ گرجوئیٹ۔“

”کیا اُسے کچھ روپیہ مل بھی گیا ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ ضرور ملا ہے۔ کیونکہ اب وہ پرنسٹن کے ایک شاندار بنگلے میں رہتی ہے۔“

”کس وکیل کی وساطت سے اُسے اپنے والد ار ہو جانے کی اطلاع ملی تھی۔“

”کیلاش ورما کی وساطت سے اور وہ اس کا قانونی مشیر بھی ہے۔“

”کیا یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ اُس لڑکی میں کتنے لوگ دلچسپی لے رہے تھے۔“

”ہاں..... میرا خیال ہے کہ پرویز ہی اُس کے متعلق بتا سکے گا۔“

”بہت بہتر۔ میں اسی وقت سے کام شروع کر ہا ہوں۔ کیا خان بہادر عاصم کو اس واقعے کی اطلاع مل چکی ہے۔“

”مل چکی ہے۔ آئی جی صاحب نے انہیں میرے ہی سامنے فون کیا تھا۔“

”اصولاً غلط ہے۔“ فریدی نے خشک لہجے میں کہا۔ ”اگر حقیقتاً اس میں قاسم ہی کا ہاتھ ہے تو.....“

اُسے روپوش کر دیا جائے گا۔“

سپرٹنڈنٹ نے اُس کے اس خیال پر رائے زنی نہیں کی۔ خاموشی سے کافی پیتا رہا۔ پھر فریدی کا پیش کیا ہوا ساگر سلگانے لگا۔

اتنے میں پورچ سے ہارن کی آواز آئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد حمید کی آواز بھی سنائی دی۔ شاید وہ باہر سے آیا تھا اور نوکروں کو متوجہ کرنے کے لئے اُس نے ہارن بجایا تھا۔

پھر وہ راہداری سے گذر رہی رہا تھا کہ فریدی نے اُسے آواز دی۔ وہ مڑا لیکن سپرنٹنڈنٹ کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔۔۔۔۔ پھر وہ اُسے سلام کرتا ہوا ڈرائیونگ روم میں چلا آیا۔

”بیٹھو۔۔۔!“ فریدی نے کرسی کی طرف اشارہ کیا اور تیسرے کپ میں کافی انڈیلنے لگا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ سپرنٹنڈنٹ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اچھا تو اب میں چلوں گا۔“

”آپ مطمئن رہئے۔ کام اسی وقت سے شروع کر دیا جائے گا۔“

کام کا نام سنتے ہی حمید کا کام تمام ہو گیا۔ لیکن سپرنٹنڈنٹ کو رخصت کرنے کے لئے پورچ تک تو

آنا ہی پڑا۔

سپرنٹنڈنٹ کی کار چلی گئی۔

”سنا ہے بارش میں بھیگنے سے اکثر نمونیہ بھی ہو جاتا ہے۔“

”ٹھیک سنا ہے۔“

”تو پھر میں چلا بھیگنے۔“

”بکواس مت کرو۔ یہ کام بہت معمولی سا ہے۔ ویسے اگر لیٹنے ہی کو دل چاہتا ہے تو مجھ سے رجوع کرو۔ مجھے عرصہ سے کسی کے ہاتھ پیر توڑنے کا موقعہ نہیں ملا۔“

”کیا قصہ ہے۔“

”دلچسپ ہے۔ تمہیں پسند آئے گا۔ آؤ اندر چلیں۔“

پھر وہ ڈرائیونگ روم میں واپس آئے اور فریدی کو سپرنٹنڈنٹ سے جو کچھ بھی معلوم ہوا تھا اُس نے

دہراتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا قاسم اُس لڑکی کے چکر میں تھا۔“

”پتہ نہیں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ قاسم میں اس قسم کے کاموں کی صلاحیت نہیں ہے۔“

”مگر وہ کسی کا آلہ کار تو بن ہی سکتا ہے۔“

”ہاں یہ ممکن ہے۔ مگر وہ بھی اسی صورت میں جب کہ اُسے سازش کا علم نہ ہو۔ یعنی یہ ہو سکتا ہے

کہ کسی نے مقصد بتائے بغیر اُسے پرویز کے خلاف اکسایا ہو۔ مگر یہ لڑکی۔ میں نے بھی دو تین دن

ہوئے اُس کا تذکرہ سنا تھا۔“

”کوشش کرو۔ اس سے شادی کر کے تم شہر کے بہت بڑے آدمی ہو سکتے ہو۔ وہ ارب پتی ہے۔“

## تفتیش

حمید فریدی کی ہدایت کے مطابق قاسم کے گھر پہنچا۔ حالانکہ بارش اُسی زور و شور کیسا تھا جاری تھی۔

پھانک ہی پر قاسم کے باپ سے ملاقات ہو گئی۔ حمید کی کار اندر جاری تھی اور اُس کی کار باہر نکل رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے تھوڑے فاصلے پر رک گئیں۔

”کون صاحب ہیں۔“ کار سے آواز آئی۔ حمید نے آواز پہچان لی۔ وہ قاسم کا باپ ہی تھا۔

”دیکھن حمید! بسلسلہ تفتیش۔۔۔!“ حمید نے جواب دیا۔

”اوہ۔۔۔۔۔ یہ بہت اچھا ہوا۔۔۔۔۔ وہ مجھے کچھ نہیں بتاتا۔ کیا یہ کیس آپ ہی لوگوں کے پاس ہے۔“

”جی ہاں۔“

”بہت اچھا ہے۔ اب میں مطمئن ہوں۔ آپ ذرا اپنی گاڑی پیچھے ہٹائیے۔ میں واپس جا رہا ہوں۔“

حمید نے کار بیک کی اور خان بہادر عاصم کی کار نکل گئی۔ پھر حمید اپنی کار پورچ کی طرف لیتا

چلا گیا۔۔۔۔۔ قاسم کی بیوی شائد عاصم صاحب کو رخصت کرنے کیلئے برآمدے تک آئی تھی اور کسی دوسری

کار کی ہیڈ لائٹس دیکھ کر وہیں رک گئی تھی اور پھر جب اُس نے حمید کو دیکھا تو بے ساختہ ہنس پڑی۔

”کیوں! آپ نہیں کیوں۔۔۔۔۔!“ حمید نے سوال کیا۔

”آپ بھی تشریف لے آئیے۔۔۔۔۔ آئیے آئیے۔ میں آپ کو ایک عبرت ناک منظر دکھاؤں۔“

”میں تفتیش کے سلسلے میں آیا ہوں۔ مگر قاسم کو کیا ملے گا سعیدہ رحمان کے اغواء سے۔“

”یہ انہیں سے پوچھئے گا۔“

”وہ ہے کہاں!“

”وہیں لے جا رہی ہوں۔ کیا آپ اس وقت اُن کے ساتھ نہیں تھے۔“

”کیا میں اُس کی دُم سے بندھا پھرتا ہوں۔“

قاسم کی بیوی ہنس پڑی لیکن حمید نے محسوس کیا کہ وہ اُس کی بات پر نہیں ہنسی۔۔۔۔۔ انداز کچھ ایسا ہی

تھا جیسے کسی مضحکہ خیز بات کے یاد آنے پر ہنس پڑی ہو۔

وہ اُسے قاسم کی خواب گاہ میں لائی۔ واقعی وہ ایک عبرت ناک منظر تھا۔ اتنا عبرت ناک کہ وہ تو

خیر پہلے ہی ہنس رہی تھی۔ حمید بھی ہنس پڑا۔

قاسم اپنی مسہری پر آرام سے لیٹا ہوا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اپنی مرضی سے کروٹ لینے کے قابل بھی نہ رہا ہو۔ کیوں کہ اس کے ہاتھ اور پیر بندھے ہوئے تھے۔

ان دونوں کو ہنستے دیکھ کر وہ پاگلوں کی طرح چیخا۔

”میں غولی مار دوں گا۔“

”تم ہل بھی نہیں سکتے اپنی جگہ سے۔ جھوٹ نہ بولو۔“ حمید نے کہا۔

”تم قیوں... کیوں آئے ہو! یہاں!“

”تمہارے تھکڑیاں لگانے کے لئے۔ سعیدہ رحمان بالکل لاوارث لڑکی ہے۔ اُس کا آخری چچا بھی مر گیا۔“

قاسم کی بیوی نے قہقہہ لگایا اور قاسم آتی ہوئی چھینک روک کر دھاڑا۔ ”ارے چپ... خدا کرے

تمہارا منہ سڑ جائے۔“

قاسم کی بیوی شائد اُسے جلانے کے لئے اس وقت بے تحاشہ قہقہے لگا رہی تھی۔ ویسے حمید نے اُسے بہت کم ہنستے دیکھ تھا۔

”تم خواہ مخواہ غصہ کر کے اپنی صحت نہ برباد کرو۔ پیارے قاسم!“ حمید اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتا

ہوا بولا۔

”ہاٹ جا۔“ قاسم نے کسی کلکھنے کتے کی طرح دانت نکال کر گردن کو جھٹکا دیا۔

”حمید بھائی... میں آپ کے لئے کافی بناؤں۔“ قاسم کی بیوی نے مسکرا کر پوچھا۔

”نہیں کوئی ضرورت نہیں۔“ قاسم غمگینا۔

”حمید بھائی... کافی کے ساتھ آپ اندرون کا حلوہ پسند کریں گے یا لوز بادام!“

قاسم غیر شعوری طور پر منہ چلانے لگا اور حمید مسکرا کر بولا۔ ”دونوں۔“

قاسم کی بیوی کمرے سے چلی گئی۔

حمید چند لمحے قاسم کو دیکھتا رہا پھر مغموم لہجے میں بولا۔ ”قاسم میں مغموم ہوں۔“

”خدا ایسا باپ گدھے کو بھی نصیب نہ کرے۔“ قاسم نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”کیا وہ تمہیں باندھ گئے ہیں۔“

”ارے یہ عورت۔“ قاسم دانت پیس کر بولا۔ ”اُس کی تو میں ہڈیاں چبا جاؤں گا۔ اسی نے مشورہ

دیا ہوگا۔ حمید بھائی تم مجھے غائب کر دو۔ ایک دم غائب کر دو۔ دو چار سال کے لئے۔“

”مگر یہ سعیدہ رحمان کا کیا قصہ ہے۔“

”ارے یار کچھ نہیں بس غصہ آ گیا تھا۔“

”کیا ہوا تھا۔“

”میں اُس سالی کو پہچانتا بھی نہیں تھا... وہ پرویز کے ساتھ آئی تھی اور وہ پرویز الو کا پٹھا مجھے دیکھ کر ہنسنے لگا۔ پتہ نہیں چکے چکے اُس سے کیا کہہ رہا تھا۔ وہ بھی ہنس رہی تھی۔ خود بھی ہنس رہا تھا۔ مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے اُس کے منہ پر پلیٹ کھینچ ماری۔ بس اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا۔ خود بخود ہال میں اندھیرا ہو گیا اور میں اندھیرے ہی میں گھر واپس آ گیا... اب یہ قصہ... میں کیا جانوں وہ سالی

کون ہے۔“

”تمہیں کس نے اکسایا تھا۔“

”کسی نے نہیں۔ اکساتا کون۔ کیا میں بیوقوف ہوں۔“

”نہیں پیارے تم تو بقرطاع ہو۔“

”تم خود ہو گے بقرطاع۔“ قاسم نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ”میں اس وقت مذاخ کے موڈ میں نہیں

ہوں۔“

”کیا میں تمہیں آزاد کر دوں۔“

قاسم تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”نہیں۔“

”کیوں!“

”ارے وہ بڑھا میرے جسم پر سے کھال اتار دے گا۔ وہ اس اُلوی پٹھی سے کہہ گیا ہے کہ جب

میں فون کروں تب ہی ہاتھ پیر کھولے جائیں۔“

”تم مجھے باپ بنا لو قاسم... اُس پر لعنت بھیجو۔“

”اچھا...!“ قاسم رو میں کہہ گیا۔ پھر سنبھل کر بولا۔ ”کیا کہا۔“

”کچھ نہیں... ہاں تو تم نے سعیدہ رحمان کے متعلق پہلے کچھ نہ کچھ ضرور سنا ہوگا۔“

”ہاں... سنا تھا۔ مگر سن کر کرتا بھی کیا... میری شادی تو ہو چکی ہے۔“

”آہا... تو یہ خیال تھا دل میں... کیوں قاسم؟ کیا تم اب فراڈ کرنا سیکھ رہے ہو۔“  
”کیوں...!“

”اس اغواء میں تمہارا ہاتھ معلوم ہوتا ہے۔“  
”میں کچھ نہیں جانتا۔“

”دیکھو! یہ کیس فریدی صاحب کے ہاتھ میں ہے۔ وہ ذرہ برابر بھی مروت نہ کریں گے۔ ویسے اگر تم لڑکی کا پیٹہ بتا دو تو شاید معاملہ بدایا جائے۔“

قاسم خاموشی سے حمید کو گھورتا رہا پھر بولا۔ ”میں کس طرح یقین دلاؤں کہ مجھے اغواء کے متعلق کچھ نہیں معلوم۔“

حمید کچھ کہنے ہی والا تھا کہ قاسم کی بیوی کافی کی ٹرے اٹھائے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔  
”مرتی بھی نہیں کسی صورت سے۔“ قاسم بڑبڑانے لگا۔

”مرنے ہی جا رہی ہوں۔ اس وقت اتنا ہی کھاؤں گی جتنا تم کھاتے ہو۔“

قاسم نے آنکھیں بند کر لیں۔ حمید نے اُس کے سر ہانے رکھی ہوئی گول میز کھسکائی اور قاسم کی بیوی نے ٹرے اُس پر رکھ دی۔ پلیٹوں میں کئی طرح کی چیزیں تھیں۔ حمید کو بھوک نہیں تھی مگر مودہ چونکہ قاسم کو غصہ دلانے والا تھا اس لئے وہ صحیح معنوں میں ٹرے پر ٹوٹ پڑا۔

”آپ بھی آئیے نا مگر بیالیاں تو دو ہی لائی ہیں آپ...!“

”تیسری کس کے لئے لاتی۔“ قاسم کی بیوی نے بڑی مصومیت سے پوچھا۔

”اپنے باوا کے کفن کے لئے۔“ قاسم حلق پھاڑ کر دھاڑا۔

اور قاسم کی بیوی کچھ اس انداز میں ہنسنے لگی جیسے قاسم کا دماغ خراب ہو گیا ہو۔

ان دونوں میں کسی طرح کی بھی مطابقت نہیں تھی۔ نہ ذہنی نہ جسمانی۔ قاسم پہاڑ تھا اور وہ گھبراہٹ

قاسم کی اُپر چیمبر بالکل ہی خالی تھی لیکن وہ خاصی ذہین عورت تھی۔ بلکہ اگر بہ نظر انصاف دیکھا جائے اُسے عورت کی بجائے لڑکی ہی کہنا چاہئے۔ عمر اٹھارہ سال سے کسی طرح زیادہ نہیں تھی... اور یہ خود ہی کا بیان تھا کہ وہ آج تک اُس کی بیوی نہیں بن سکی۔

وہ اُس کے چچا کی لڑکی تھی۔ یہ بے جوڑ شادی اس لئے ہوئی تھی کہ گھر کی دولت گھر ہی رہے۔ ورنہ شاید کوئی بھک منگا بھی ایسی بے جوڑ شادی کو پسند نہ کرتا... بہر حال شاید یہ مایوسانہ جنسی زندگی

لاش کا قبضہ  
کار عمل تھا کہ وہ اُسے اس طرح زچ کیا کرتی تھی اور اُسے تکلیف میں دیکھ کر اُسے ذرہ برابر بھی رحم نہیں آتا تھا۔

وہ دونوں ہنس کر کافی پیتے رہے اور پلیٹوں پر ہاتھ صاف کرتے رہے۔

”اُبے حمید کے پٹھے۔“ قاسم حلق پھاڑ کر چیخا۔ ”میں تمہارا گلا گھونٹ دوں گا۔“

”کیوں بھی! کیا بگاڑا ہے میں نے تمہارا۔“ حمید نے آہستہ سے کہا۔

”تم یہاں سے چلے جاؤ۔“

”میں یہاں ایک تفتیش کے سلسلے میں آیا ہوں۔“ حمید نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”خدا عارت کرے تمہیں۔“ قاسم نے کہا پھر اپنی بیوی پر غرایا۔ ”میں قروٹ... کروٹ بدلنا چاہتا ہوں۔“

”بدل لو... میں نے کب منع کیا ہے۔“ اُس نے لا پرواہی سے کہا۔

”میں یا لروں... یا اللہ...!“ قاسم نے جھلاہٹ میں سر اٹھا کر مسخری پر دے مارا۔

”اے... رسیاں ڈھیلی نہ ہونے پائیں ورنہ چچا جان کو فون کر دوں گی۔“

قاسم دانت پس کر رہ گیا۔ اُس کا بس چلتا تو وہ اُس کی گردن مروڑ کر کھڑکی کے باہر پھینک دیتا۔

حمید نے کافی ختم کر کے پائپ سلگایا اور قاسم کی طرف دیکھ کر اُس کی بیوی سے بولا۔ ”مجھ سے

اس کی یہ حالت نہیں دیکھی جاتی۔“

”مجھ سے بھی نہیں دیکھی جاتی۔ اس لئے میں آدھے گھنٹے کے اندر ہی اندر نو کروں سمیت یہاں

سے چلی جاؤں گی۔“

”ناگنیں توڑ دوں گا اگر گھر کے باہر قدم نکالا۔“ قاسم نے گرج کر کہا۔

”ذرا زبান سنبھال کر۔ ورنہ میں چچا جان کی دوسری تجویز پر بھی عمل شروع کرادوں گی۔“

”کیسی تجویز۔“

”یہی کہ ہر پندرہ منٹ بعد تم پر ایک بالٹی ٹھنڈا پانی ڈالا جائے۔“

”ارے خدا عارت کرے جھوٹوں کو۔ یہ کب کہا تھا۔“

”کہا تھا۔“ قاسم کی بیوی سر ہلا کر بولی۔ ”الگ لے جا کر کہا تھا۔“

”جھوٹ... جھوٹ... اللہ قسم۔ بالکل جھوٹ۔“ قاسم بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”فون اٹھا دوں... پوچھ لو۔“

”میں نہیں پوچھتا... حمید بھائی بس اب مجھے کھول دو۔ حد ہو چکی... ایسا باپ... ارے باپ رے باپ۔ اللہ قسم تہلکہ پچا دوں گا۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ ابھی سیدھا کسی رنڈی کے کوٹھے پر جاؤں گا۔ اتنی بیویں گا کہ پھٹ جائے۔ کھول دو حمید بھائی۔ میں استبداد کرتا ہوں۔“

”استبداد کیا۔“ حمید نے حیرت ظاہر کی۔

”اے خوشامد۔“ قاسم جھنجھلا کر چیخا۔

”خوشامد اسی طرح کی جاتی ہے۔“

قاسم خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا اور ہونٹ ہلاتا رہا پھر بولا۔ ”کھول دو حمید بھائی! تم میرے بڑے بھائی ہو۔ اب میں تمہیں کبھی برا بھلا نہیں کہوں گا۔ اور... اور... وہ سعیدہ رحمان کا پتہ بھی بتا دوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ ایک کوشری نہیں کوشی... ارر یعنی کہ ایک جگہ بند کر دی گئی ہے۔“

”میں سچ کہتی ہوں حمید بھائی۔ یہ محض بکواس ہے۔ آپ ہرگز نہ کھولے گا۔ ورنہ چچا جان...!“

”خاموش...!“ قاسم اتنے زور سے دھاڑا کہ آواز پھٹ گئی اور اس پر کھانسیوں کا دورہ پڑ گیا۔

انہیں کھانسیوں کے درمیان وہ اپنی بیوی کے والدین کی خبر بھی لیتا جا رہا تھا۔

حمید آگے بڑھ کر اُسے کھولنے لگا اور قاسم کی بیوی میز سے ٹرے اٹھا کر کھسکے لگی۔

”بھاگی کہاں جاتی ہو۔ ٹھہرو نا۔۔۔۔۔ رک جاؤ۔“ قاسم جلے کٹے لہجے میں بولا۔

لیکن اب وہ کہاں رکنے والی تھی۔



فریدی کی کار اُس عمارت کے سامنے رکی۔ جہاں سر سلیمان کے لڑکے پرویز کے ملنے کی توقع کی جاسکتی تھی۔ اس عمارت میں پرویز تنہا رہتا تھا بقیہ خاندان والوں سے الگ تھلگ۔ وہ ایک عیاش طبع آدمی تھا اور اس سلسلے میں کافی بدنام بھی۔

کمپاؤنڈ کا پھاٹک کھلا ہوا تھا۔ لیکن فریدی نے کار باہر ہی چھوڑ دی۔ دو تین جگہ اندھیرے میں اُس کے پیر کچڑ میں پڑے۔ بارش اب تھم گئی تھی۔ بادل پھٹ گئے تھے اور ان کی دراڑوں سے جگہ جگہ تاروں کے جھنڈ جھانک رہے تھے۔

کمپاؤنڈ تاریک پڑی تھی لیکن عمارت کی بعض کھڑکیاں روشن تھیں۔ وہ برآمدے میں پہنچ کر رک گیا۔ یہاں بھی تاریکی تھی۔ اُس نے مارج روشن کی اور اُس کا دائرہ مختلف اطراف میں رینگتا رہا۔ پھر

اُس نے کال بل کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔

دو منٹ بعد دروازہ کھلا۔ راہداری میں خود پرویز کھڑا تھا۔ فریدی نے اُسے پہچان لیا اور شائد وہ بھی فریدی کو پہچانتا تھا۔

”اوہو! کرنل صاحب۔ تشریف لائیے... تشریف لائیے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ کیس آپ ہی کے سپرد کیا جائے گا۔ میری خوش قسمتی۔“

فریدی خاموشی سے چلتا رہا۔ وہ اُسے نشست کے کمرے میں لایا۔

”تشریف رکھئے جناب۔ اب اس وقت میں آپ کی کیا خاطر کروں۔ شرابوں میں بھی صرف اسکاچ ہے۔ اگر آپ پسند فرمائیں۔“

”شکریہ... میں شراب نہیں پیتا۔“ فریدی نے خشک لہجے میں کہا۔

”تب میں معافی چاہتا ہوں۔“

”کوئی بات نہیں۔“ فریدی اُسکی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔ ”آپ دونوں کی دوستی کتنی پرانی تھی۔“

”اوہ...!“ پرویز بے ڈھنگے پن سے ہنسا۔ ”آج چوتھا دن تھا۔“

”کیا اُس سے پہلی ملاقات اتفاق تھی۔“

”نہیں... میں خود ہی ملا تھا۔“

”آج کیا آپ اُسے اُس کے گھر سے لائے تھے۔“

”نہیں... شہر میں ملاقات ہو گئی تھی۔“

”آپ اُسے آرکچو لے گئے تھے یا خود اُسی نے وہاں چلنے کی فرمائش کی تھی۔“

”جی نہیں... میں اُسے لے گیا تھا۔ مگر ان سوالات سے کیا حاصل۔“

”پھر آپ ہی فرمائیے کہ کس قسم کے سوالات کروں۔“ فریدی اُسے گھورتا ہوا بولا۔

پرویز گڑبڑا گیا۔ پھر سنبھل کر بولا۔ ”معاف کیجئے گا۔ میں نے یہ بات یونہی کہہ دی تھی۔ میں

آپ کے ہر سوال کا جواب دینا چاہتا ہوں۔“

”قاسم سے پہلے بھی آپ کا جھگڑا ہوا تھا۔“

”جھگڑے کی بنیاد بھی تعلقات ہی پر ہوتی ہے۔ میں نے کبھی اُسے منہ ہی نہیں لگایا جھگڑا کیا ہوتا۔“

”اور آج اُس نے خواہ مخواہ آپ پر پلیٹ کھینچ ماری۔“



”جی ہاں.... خواہ خواہ.... ہم میں کبھی بول چال بھی نہیں رہی۔ کبھی رسی طور پر بھی ہم نے ایک دوسرے کی مزاج پر سی نہیں کی۔“

”سعیدہ کے یہاں کبھی قاسم بھی نظر آیا تھا آپ کو۔“

”کبھی نہیں۔“

”کیا آج سعیدہ نے اُس سے کوئی گفتگو کی تھی۔“

”جی نہیں۔ میرا خیال ہے کہ سعیدہ اُسے جانتی بھی نہیں۔“

”سعیدہ کے ملنے والوں میں کن لوگوں کو آپ جانتے ہیں۔“

”میں کسی کو نہیں جانتا۔“

”کیا اُس نے کبھی اپنے دوستوں کا تذکرہ آپ سے نہیں کیا۔“

”جی نہیں۔“

”تو آپ کا خیال ہے کہ اس انواء میں قاسم کا ہاتھ ہے۔“

”میرا کچھ بھی خیال نہیں ہے۔ جس طرح یہ واقعہ پیش آیا تھا آپ کے علم میں آچکا ہے۔ اب

نتائج آپ ہی اخذ کر سکتے ہیں۔ نہ میں کسی پر شبہ ظاہر کر سکتا ہوں۔“

”آپ کی شادی ہو چکی ہے۔“

”نہیں....!“ پرویز نے کچھ اس انداز میں جواب دیا جیسے یہ سوال ناگوار گذرا ہو۔

”آپ ہی کی طرح شہر کے بہترے کنوارے اُس سے شادی کے خواہش مند ہوں گے۔“

پرویز کچھ نہ بولا۔ فریدی بہت غور سے اُس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اُس نے کہا۔

”قاسم کنوارہ نہیں ہے۔“

”مگر وہ کسی دوسرے کا آلہ کار تو بن سکتا ہے۔“ پرویز بولا۔

”ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ کسی کے خلاف شبہ نہ ظاہر کریں گے۔“ فریدی مسکرایا۔

”دیکھئے اب میں صاف صاف عرض کر دوں۔ والد صاحب اور خان بہادر عاصم کے تعلق۔“

”اچھے نہیں۔ عاصم انہیں ہر میدان میں شکست دینے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔“

”تب پھر یہ بھی ممکن ہے کہ اس میدان میں آپ کے والد صاحب نے اُسے شکست دے

کوشش کی ہو۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

”میں کچھ سمجھانے کے لئے نہیں آیا۔“ فریدی نے لا پرواہی سے کہا۔ ”بلکہ سمجھنے.... کیا آپ مجھے

سمجھنے کا موقع دیں گے۔“

”میں پھر نہیں سمجھا۔“

فریدی گھڑی دیکھتا ہوا بولا۔ ”میں تین بجے تک پھر آؤں گا یا پھر فون کروں گا۔ کیا آپ جاگتے

رہیں گے۔“

”ایسے واقعہ سے دوچار ہونے کے بعد کون سو سکتا ہے کہ قتل صاحب۔ مگر آپ مجھے ایک نئی الجھن

میں مبتلا کئے جا رہے ہیں۔“

فریدی یہ پوچھے بغیر اٹھ گیا کہ وہ نئی الجھن کس قسم کی ہو سکتی ہے۔

## وزیٹنگ کارڈس

حمید نے لحاف سے سر نکال کر فون کو گالی دی جس کی گھنٹی کسی طرح رکنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔

گالیاں سننے کے باوجود بھی بجتی ہی رہی۔ حمید دھاڑتا ہوا بستر سے اٹھا اور فون پر ٹوٹ پڑا۔

دوسری طرف سے بولنے والا فریدی ہی تھا.... اور ستم یہ کہ وہ اپنی خواب گاہ سے بول رہا تھا۔ یعنی

اتنے فاصلے سے جتنا کسی دیوار کے درمیان میں حائل ہو جانے سے پیدا ہو سکتا ہے۔ دونوں کی خواب

گاہوں میں صرف ایک دیوار حائل تھی۔

”کیا مطلب ہے آپ کا۔“ حمید ماؤتھ پیس میں دھاڑا۔ ”میں یہ فون اپنی چھاتی پر باندھ کر

سویا کروں۔“

”شکریہ! تم نے یہ نئی بات بھائی۔ یقیناً تمہیں یہی کرنا چاہئے۔“ فریدی نے آہستہ سے کہا۔

”مگر تم مجھے رپورٹ دیئے بغیر سو کیوں گئے تھے۔“

”مرو تو نہیں گیا تھا۔“

”اُس صورت میں قبر سے اکھاڑ کر رپورٹ نہ طلب کی جاتی۔“

”رپورٹ بھی اس وقت سوری ہوگی۔“

”بکواس بند.... رپورٹ۔“

حمید کچھ نہ بولا۔

”ہلو.....!“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”قاسم، سعیدہ کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔“

”اُسے کس نے اکسایا تھا۔“

”کسی نے بھی نہیں۔ میری ہی طرح اُسے بھی غصہ آ گیا تھا۔ اُس نے پلیٹ پرویز کے منہ پر کھنچ

ماری تھی..... اور میں..... اور میں یہ ریسوراپے سر پر مارنے جا رہا ہوں۔“

”کس بات پر غصہ آ گیا تھا۔“

حمید نے گردن ہلا کر ایک طویل سانس لی اور بولا۔ ”وہ دونوں اُسے دیکھ کر ہنسے تھے۔“

”ہوں..... قاسم اس وقت کیا کر رہا تھا جب تم پہنچے تھے۔“

”مزے کر رہا تھا..... بڑا خوش قسمت آدمی ہے۔“

”پھر بکواس شروع کر دی۔“

”ارے جناب..... وہ جس حال میں بھی تھا کم از کم سو تو سکتا تھا۔ اُس کے باپ نے اُسے مسز

سے باندھ دیا تھا۔“

”کیوں!“

”کیا اب اسی وقت یہ بھی معلوم کرنا پڑے گا۔“

”جواب دو۔“ فریدی جھلا گیا۔

”نہ میں نے وجہ پوچھی اور نہ اُس نے بتایا۔ البتہ میں اُسے کھول ضرور آیا تھا۔ ہرگز نہ کھولنا مگر اُس

گدھے نے مجھے اس وقت اُلوی بنا دیا۔ کہنے لگا میں جانتا ہوں جہاں سعیدہ لے جانی گئی ہے مگر اُس

نے شرط یہ رکھی تھی کہ کھول دینے ہی پر بتائے گا۔ بہر حال میں نے کھول دیا..... ظاہر ہے کہ وہ محض بکواس

تھی۔ وہ اُس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ میں کہتا ہوں آخر یہ مصیبتیں ہم پر ہی کیوں نازل ہوتی

ہیں۔ اگر صرف ہم ہی رہ گئے ہیں تو بقیہ عملہ درخواست کیوں نہیں کر دیا جاتا۔“

”اگر بقیہ عملہ ابھی سے درخواست کر دیا گیا تو پھر تمہاری بارات میں کون شرکت کرے گا۔“

اُس مال دار لڑکی سے تمہاری شادی کرنا چاہتا ہوں اور سنو میں اس وقت بستر میں نہیں ہوں۔“

”میں جانتا ہوں کہ آپ کارنس پر بیٹھے ہوں گے۔ مگر کیا کروں آپ کا غصہ فضول ہے۔“

”کپڑے تبدیل کرو۔“

”نہیں آپ مجھے انہیں کپڑوں میں دفن کر دیجئے۔ مجھے کوئی شکایت نہ ہوگی۔“

”جلدی کرو۔ میں نے ابھی پرویز کو فون کیا تھا لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔“

حمید نے گھڑی کی طرف دیکھا سوا تین بجے تھے۔ اُس نے کہا۔ ”کیا پرویز بھی آپکا اسٹنٹ ہے۔“

”حمید وقت نہ برباد کرو۔“

حمید نے ریسور کرپڈل پر بیچ کر ڈرینگ الماری کھولی اور کپڑے نکالنے لگا۔ وہ اس وقت اس

کے علاوہ اور کچھ نہیں سوچ رہا تھا کہ وہ خود ہی اُلوکا پٹھا ہے۔

بیس منٹ کے اندر ہی اندر وہ گھر سے روانہ ہو گئے۔ بارش ڈیڑھ بجے ختم ہو چکی تھی اور اب آسمان

کھل گیا تھا۔ لیکن سڑکوں پر اب بھی پانی نظر آ رہا تھا۔

فریدی نے اس وقت جیب کا رنگالی تھی۔

”پرویز سے تو آپ مل آئے تھے۔ پھر اب.....!“ حمید نے کچھ کہنا چاہا لیکن فریدی درمیان ہی

میں بول پڑا۔ ”میں نے اُس سے کہا تھا کہ وہ تین بجے تک میرا یا میری کال کا انتظار کرے۔“

”کیوں.....!“

”بس یونہی..... میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کس طرح میرا یا میری کال کا انتظار کرتا ہے یعنی کس حال

میں۔“

”ادھو..... تو کیا آپ کو توقع تھی کہ وہ سر کے بل کھڑا ہو کر آپ کا انتظار کرے گا۔“

”نہیں..... میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ میں جو کچھ بھی دیکھنا چاہتا تھا شاید اب نہ دیکھ سکوں

کیونکہ مجھے فون کے بغیر ہی وہاں پہنچنا چاہئے تھا۔“

”میں سمجھا۔ آپ شاید سوچ رہے ہیں کہ یہ خود اُسی کی حرکت بھی ہو سکتی ہے۔“

”امکانات ہیں۔ وہ لڑکی تو سونے کی چڑیا ہے۔ ہر ایک اُسے حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔“

”مگر یہ صورت پرویز کے لئے فائدہ مند کیسے ثابت ہو سکتی ہے۔ وہ زبردستی اس سے شادی تو نہ

کر سکے گا۔“

”کیوں کیا ہوا۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے فی الحال اُس نے اُسے غائب کر دیا ہو اور کچھ

دنوں بعد وہ میاں بیوی کی حیثیت سے منظر عام پر آ جائیں۔“

”زبردستی اغواء کرنا اور بات ہے اور زبردستی شادی کرنا اور.... کیا یہ ضروری ہے کہ سعیدہ اس پر آمادہ ہی ہو جائے۔“

”میں اس مسئلے پر بحث نہیں کرنا چاہتا۔ یہ ابھی محض خیال ہی ہے۔ وہ بھی اس بناء پر کہ اس کے کئی طلب گار تھے۔ ممکن ہے پرویز کو ان میں سے کسی کے کامیاب ہو جانے کا خدشہ رہا ہو۔ پرویز یہ بھی سوچ سکتا ہے کہ وہ اس طرح اُسے اپنا سکے گا اور پھر یہ تو بتاؤ اگر ایک عورت کی زندگی زبردستی برباد کر دی جائے اور پھر وہی آدمی اُس سے شادی کی درخواست کرے۔ ایسی صورت میں کیا وہ عورت انکار کر دے گی۔ میرا خیال ہے کہ وہ مان جائے گی۔“

”دیکھئے.... اس معاملے میں آپکے خیال کو کوئی اہمیت نہیں دی جاسکتی کیونکہ آپ عورتوں کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔“ حمید نے براہِ سامنہ بنا کر کہا۔ ”فرض کیجئے سعیدہ رحمان شریف عورت نہیں ہے۔ یعنی جس بے راہ روی اُسکے نزدیک کوئی بُری بات نہیں ہے۔ پھر آپکی فطرت شناسی کیا کہے گی۔“

”دم بخورہ جائے گی۔“ فریدی نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ ”لیکن اُس صورت میں بھی.... وہ اُس سے شادی ضرور کر لے گی۔ کیا بعض شادی شدہ عورتیں بھی جنسی بے راہ روی کا شکار نہیں ہوتیں۔ اغواء ایک دھبہ ہے حمید صاحب جو زندگی بھر اپنا اعلان کرتا رہتا ہے۔ اس لئے کوئی بُری عورت بھی ایسے مواقع پر شادی ہی کو ترجیح دے گی۔ وہ عورتیں جن کی برائیاں چھپی ہوئی ہوں خاص طور سے یہی چاہیں گی کہ کسی ایک سے ان کے تعلقات کا اعلان ہو جائے.... رہی سعیدہ تو میرا خیال ہے کہ اُس میں اگر برائیاں تھیں تو منظر عام پر نہیں آئی تھیں۔ ورنہ اُس کے طلب گاروں میں تھوڑی بہت ہچکچاہٹ ضرور پائی جاتی۔“

”ہوگا.... مجھے کیا۔“ حمید نے لا پرواہی سے کہا۔

”کچھ دیر خاموشی رہی پھر اُس نے پوچھا۔“ کیا اس بے سرو پاکیں میں آپ کا دل لگ رہا ہے۔“

”میں نے اسے اپنی خوشی سے نہیں لیا۔ یہ تو زبردستی آیا ہے۔“

”لیکن اس کے باوجود بھی آپ میری اور اپنی نیندیں برباد کر رہے ہیں۔“

”وقتی ضرورت۔ یہ کسی بینک کی ذمہ داری کا قصہ تو ہے نہیں۔ ایک ذی روح لڑکی کے اغواء کا قصہ ہے۔“

”ٹھہریئے۔“ حمید بول پڑا۔ ”دیکھئے کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ حرکت لڑکی کے کسی غریب عاشق کی ہو۔“

”یہ بھی ممکن ہے۔ اس زاویے سے بھی اس پر غور کر چکا ہوں۔ وہ پہلے ایک معمولی سی لڑکی تھی ممکن

ہے کسی معمولی سے آدمی سے اُس کے تعلقات رہے ہوں۔“

”محبت کا نام نہیں آئے گا زبان پر....“ حمید نے جلتے بھنے لہجے میں کہا اور فریدی ہنس پڑا۔

”چلو محبت ہی سہی۔“ اُس نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے اچانک دولت مند ہو جانے کے بعد وہ کسی اونچے قسم کے شوہر کے خواب دیکھنے لگی ہو اور اُس معمولی آدمی کو یہ بات گراں گزری ہو۔“

”بس پھر واپس چلے۔ چل کر سو جائیں۔ صبح اُس معمولی سے آدمی کو تلاش کریں گے۔“

وہ پرویز کی قیام گاہ کے قریب پہنچ چکے تھے۔ فریدی نے کار تھوڑے فاصلے ہی پر روک دی۔

وہ دونوں کار سے اتر گئے۔ پھانک کھلا ہوا تھا اور پائیں باغ سنسان پڑا تھا۔ ایک آدھ کھڑکی میں روشنی بھی نظر آ رہی تھی۔

برآمدے میں تاریکی نظر آئی۔ فریدی نے نارنج روشن کر کے کال مل کا مٹن دبایا۔ دباتا ہی رہا لیکن اندر سے کوئی جواب نہ ملا۔

”اوہ.... اُس نے کہا تھا کہ میں آپ کے انتظار میں رات بھر جاگتا رہوں گا۔“ فریدی بڑبڑایا۔

”میں پھر عرض کروں گا کہ وہ آپ کا اسٹنٹ نہیں ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”کیا یہاں ملازمین بھی نہیں رہتے۔“

”پتہ نہیں۔ پہلی بار جب میں آیا تھا تب بھی کوئی نہیں نظر آیا تھا۔“

”پھر اب کیا ارادہ ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ اگر ہم یونہی چلے چلیں تو اُسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا اور یہی مناسب بھی ہے۔“

”چلے صاحب!“ حمید نے ایک طویل سانس لی۔

”اوہ.... یہ دروازہ بھی کھلا ہوا ہے۔“ فریدی آگے بڑھتا ہوا بولا۔ ”پھانک بھی بند نہیں تھا۔“

وہ عمارت میں داخل ہوئے۔ چاروں طرف سکوت طاری تھا۔ وہ آگے بڑھتے رہے۔ سارے کمرے خالی پڑے ہوئے تھے۔ عمارت میں انہیں ایک بھی تنفس نظر نہ آیا۔

پھر وہ باہر نکل آئے۔ ساری کپاؤں چھان ماری اور اُسی دوران میں انہیں معلوم ہوا کہ نوکروں کے کوارٹر عمارت کی پشت پر موجود تھے۔

نوکروں کو جگایا گیا۔ لیکن انہوں نے بھی پرویز کی موجودگی یا عدم موجودگی سے لاعلمی ظاہر کی۔

انہوں نے بتایا کہ وہ لوگ اُس کی خدمت کے سلسلے میں کسی خاص وقت کے پابند نہیں ہیں۔ اکثر کی دن پر ویز وہاں نہیں آتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اُس کی آمد اور روانگی کا انہیں علم تک نہیں ہوتا۔  
”اب کیا خیال ہے۔“ فریدی نے واپسی پر حمید سے سوال کیا۔

”کچھ بھی نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ ہم کسی معقول آدمی کو تلاش کریں، لیکن کیا آپ سعیدہ کی قیام پر بھی گئے تھے۔“

”اب وہیں جانے کا ارادہ ہے۔“

”مر گئے۔“ حمید کراہا۔

سعیدہ پرنسٹن کے علاقے کے ایک شاندار مکان میں رہتی تھی۔ یہ مکان بھی اُس وکیل ہی کی وساطت سے اُسے ملا تھا جس نے اُس کے بچے کے کاغذات اُس کے سپرد کیے تھے۔ ورنہ وہ پہلے متوسط طبقہ کے لوگوں میں رہتی تھی۔ فریدی کی جیب ایک عمارت کے سامنے رک گئی اور اُس نے اتر کر کال بل کاٹن دبایا۔ دروازہ کھلنے میں دیر نہیں لگی۔ غالباً وہ ملازم ہی تھا۔

”اوہو.... تم ابھی تک جاگ رہے ہو۔“ فریدی نے اُس سے کہا۔

”جج جی ہاں.... مگر میں نے..... پیچانا نہیں حضور کو۔“ نوکر نے رک رک کر متحیرانہ انداز میں کہا۔

”اوہ.... ہم یہاں پہلی بار آئے ہیں۔ سعیدہ صاحبہ کو ہمارا کارڈ دو۔“

”وہ تو موجود نہیں ہیں جناب۔“

”کیا اس وقت.... ارے کیا وہ رات بھر یہاں تھیں ہی نہیں۔“

”نہیں جناب۔“

”ہم پولیس سے تعلق رکھتے ہیں۔ ذرا ہم مکان کو اندر سے دیکھنا چاہتے ہیں۔“

”یہ کیا معاملہ ہے حضور! ابھی ایک گھنٹہ پہلے ایک صاحب آئے تھے۔ تھانیدار تھے شاید وہ بھی

دیکھ کر گئے ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ بی بی جی کہیں غائب ہو گئی ہیں۔“

”اوہ.... کیا وہ تھانیدار صاحب وردی میں تھے۔“

”جی ہاں.... جناب۔“

”یہیں کے تھانے سے آئے تھے۔“

”نہیں جناب! کو توالی سے آئے تھے۔ انہوں نے یہی کہا تھا۔“

”یہاں فون ہے۔“

”ہے.... جناب۔“

”میں کو توالی فون کروں گا۔“

”آئیے.... ادھر تشریف لے چلے۔“ وہ ایک طرف ہٹا ہوا بولا۔

فریدی نے کو توالی فون کیا لیکن وہاں سے معلوم ہوا کہ کوئی سب انسپکٹر سعیدہ رحمان کے گھر پر نہیں

بھیجا گیا تھا۔ فریدی ریسپورر رکھ کر ملازم کی طرف مڑا۔

”انسپکٹر نے کیا دیکھا تھا۔“

”بی بی جی کے سونے کا کمرہ۔“

”تم ساتھ تھے۔“

”جی ہاں جناب۔“

”اُس نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ وہ تنہائی چاہتا ہے۔“

”نہیں جناب۔“

”اُس نے کچھ سوالات بھی کئے ہوں گے تم سے۔“

”جی ہاں ملنے جلنے والوں کے بارے میں پوچھا تھا.... اور جی ہاں.... وہ ملاقاتیوں کے کارڈ بھی

لے گئے۔“

”کیا مطلب....!“

”وہ کارڈ جو ملنے والے اندر بھجواتے تھے۔ ہر نئے ملاقاتی کا کارڈ بی بی جی بہت احتیاط سے

رکھتی تھیں۔“

”اوہ....!“ فریدی اُس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

”کیا اُس نے کارڈ مانگے تھے۔“

”جی نہیں انہوں نے ملنے جلنے والوں کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ لیکن چونکہ میں کسی کے بھی

نام نہیں جانتا اسلئے نہ بتا سکا۔ پھر مجھے یاد آ گیا کہ بی بی جی تو اُنکے کارڈ بہت احتیاط سے رکھتی تھیں۔“

”تو تم نے خود ہی کارڈوں کا تذکرہ کیا تھا۔“

”جی ہاں۔“

”کارڈوں کی تعداد کیا تھی۔“

”میں نے گئے نہیں تھے مگر میرا خیال ہے کہ بیس پچیس ضرور رہے ہوں گے۔“

”کیا تم اُن میں سے کسی کا نام بتا سکتے ہو۔“

”نہیں حضور! ایک کا بھی نہیں۔“

”اچھا... کیا آج شام کو وہ کسی کے ساتھ باہر گئی تھیں۔“

”جی نہیں... تھا۔“

”کیا یہاں کبھی کوئی ایسا آدمی بھی آیا ہے جو بہت زیادہ لمبا اوڑ بہت زیادہ موٹا رہا ہو۔“ حمید نے پوچھا۔

”نہیں جناب... ایسا تو کوئی آدمی کبھی نہیں آیا۔“

فریدی نے حمید کو اس طرح گھور کر دیکھا جیسے اُس کی دغل اندازی پسند نہ آئی ہو۔ حمید نے پھر کوئی سوال نہیں کیا۔

”سعیدہ کے سارے ملنے والے بڑے آدمی ہوں گے۔“ فریدی نے کہا۔

”نہیں صاحب! اکثر بی بی جی کے دفتر کے لوگ بھی آتے ہیں۔ پہلے بی بی جی دفتر میں کام کرتی تھیں نا۔“

”تم اُن میں سے کسی کا نام بتا سکو گے۔“

”نہیں حضور! نام تو کسی کا بھی نہیں جانتا۔“

”اُن میں کوئی ایسا بھی ہے جو بہت زیادہ آتا ہو۔“

”جی ہاں! ایک صاحب ہیں لیکن نام اُن کا بھی نہیں جانتا۔ وہ بہت اچھا گاتے ہیں۔ بی بی جی اکثر اُن کا گانا کرتی تھیں۔“

”اُسی دفتر کا کوئی آدمی ہے۔“

”جی ہاں! بی بی جی نے یہی بتایا تھا۔ وہ اپنے دفتر کے لوگوں کا بہت خیال رکھتی ہیں۔“

”تم سعیدہ کے ساتھ کب سے ہو۔“

”جب سے وہ اس مکان میں آئی ہیں۔“

”تمہارے علاوہ اور کتنے ملازم ہیں۔“

”تین مرد اور ایک عورت... ہم کل پانچ ہیں۔“

”سعیدہ کا کوئی عزیز بھی یہاں رہتا ہے۔“

”نہیں جناب! اُن کے بیان کے مطابق اُن کا کوئی عزیز نہیں ہے۔“

”اچھا... کیا اُس انسپکٹر نے عمارت کا کوئی حصہ خاص طور سے دیکھا تھا۔“

”جی نہیں! بس وہ صرف ٹھلے رہے تھے۔ پھر اُن کے سونے کے کمرے میں آ بیٹھے تھے۔ قریب

قریب اسی قسم کے سوالات انہوں نے بھی کئے تھے جیسے آپ کر رہے ہیں۔“

فریدی چند لمحے خاموش رہا۔ پھر اُس نے دوسرے نوکروں کو بھی طلب کیا اور اُن سے بھی علیحدہ علیحدہ مختلف قسم کے سوالات کرتا رہا۔

حمید اندازہ نہیں کر پایا کہ فریدی کیس کے متعلق کس نکتہ نظر کو ذہن میں رکھ کر یہ ساری پوچھ گچھ کر رہا ہے۔ وہ خاموشی سے ساری کارروائی دیکھتا رہا۔

پھر کچھ دیر بعد اُس نے پوری عمارت کی معمولی سی تلاشی لی اور اس تلاشی کے دوران میں حمید نے محسوس کیا کہ وہ سعیدہ کے نام آئے ہوئے خطوط پر زیادہ دھیان دے رہا ہے۔ لیکن اب اُسے اس معاملے سے ذرہ برابر بھی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی کیونکہ اُس کی پلکیں نیند کے دباؤ سے بوجھل ہوئی جا رہی تھیں۔

واپسی پر جب میں بیٹھے وقت اس نے بڑے دردناک لہجے میں کہا۔ ”ہائے صبح ہو گئی۔“

فریدی کچھ نہ بولا۔ لیکن ٹھنڈی ہوا کے تھپڑوں نے حمید کی نیند غائب کر دی۔

”آخر آپ اتنی دیر تک کیا کرتے رہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”کھیل لمبا ہو جائے گا شاید۔“ فریدی بڑبڑایا۔ ”آخر وزیٹنگ کارڈ لے جانے کا کیا مطلب

ہو سکتا ہے اور پھر آنے والا پولیس کی وردی میں تھا۔“



دوسری صبح پرویز کی کار فریدی کی کپاؤٹ میں داخل ہوئی۔ وہ عجیب حالت میں تھا۔ لباس تار تار بال اُلجھے ہوئے اور چہرے پر بڑی بڑی خراشیں۔

نوکروں نے اُسے اگر ایک شاندار گاڑی سے نہ اترتے دیکھا ہوتا تو شاید دھکے مار مار کر کپاؤٹ سے باہر کر دیتے۔

”میرے پاس اس وقت میرا کارڈ نہیں ہے۔“ اُس نے ایک نوکر سے کہا۔ ”کرل صاحب سے

کہو پرویز صاحب ہیں.... جلدی کرو۔“

نوکر اندر چلا گیا اور جلد ہی واپس آ کر اس نے اندر چلنے کو کہا۔

فریدی نے بھی ڈرائنگ روم میں پہنچنے میں دیر نہیں لگائی۔ اس کی آنکھیں خمار آلود ضرور تھیں لیکن وہ شب خوابی کے لباس میں نہیں تھا۔

پرویز کی حالت دیکھ کر اس نے حیرت نہیں ظاہر کی۔

”بیٹھ جائیے۔“ اس نے خود بھی بیٹھتے ہوئے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”کیا آپ کو مجھے اس حال میں دیکھ کر حیرت نہیں ہوئی۔“ پرویز نے کہا۔

”اس سے زیادہ بُرے حالات میری نظروں سے گزرتے رہتے ہیں۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”میرے خدا۔“ پرویز مضطربانہ انداز میں اپنے منہ پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔ ”میں سمجھ گیا۔ آپ مجھ

پر شبہ کر رہے ہیں۔“

”کیسا شبہ مسٹر پرویز!۔“

”کچھ نہیں آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تین بجے آؤں گا یا فون کروں گا۔“

”ہاں مسٹر پرویز۔ میں نے فون بھی کیا تھا۔ اور گیا بھی تھا۔“ فریدی کا لہجہ حد درجہ سرد تھا۔

”اور اب میں اس حال میں آپ کے سامنے ہوں۔“

”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔“

”مجھے کچھ لوگ زبردستی میری قیام گاہ سے لے گئے تھے۔ یہ ڈھائی بجے کا واقعہ ہے۔“

فریدی خاموش رہا۔۔۔ صرف جواب طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پرویز بولا۔

”انہوں نے زبردستی کی۔ میں لڑ گیا۔ وہ پانچ تھے اور میں تنہا۔ انہوں نے میرے منہ میں کپڑا ٹھونسا

آنکھوں پر پٹیاں باندھیں اور نہ جانے کہاں لے گئے۔ کچھ دیر بعد میں نے خود کو ایک عمارت میں پایا

لیکن یہ نہیں بتا سکتا کہ شہر کے کس حصے میں تھا۔ انہوں نے میرے کپڑے پھاڑے میرا منہ نوچا۔۔۔ اور

پھر۔۔۔ مجھے شراب پلائی۔۔۔ اور میرے پاس دو لڑکیاں چھوڑ گئے جو مجھے تھوڑے تھوڑے وقفے سے

شراب پلاتی رہیں۔ میرا دل بہلانے کے لئے مدہم سروں میں گیت گاتی رہیں۔ میں ایک ستون سے

بندھا ہوا تھا۔ کچھ دیر تک وہ مجھ سے لگاؤ کی باتیں کرتی رہیں پھر میرے گالوں پر تھپڑ مارنے شروع

کر دیئے۔ کبھی وہ دو تیس اور کبھی ہشتیس، کبھی مجھے پیار کرتیں اور کبھی تھپڑ مارنے لگتیں۔“

”پھر اتنے میں سندباد جہازی داخل ہو کر رش بجالایا اور مجرا کر نیکا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ریڈیو اسٹیشن

نے ذوالیاں نشر ہونے لگیں اور اس نے مجرا کرنے کا ارادہ ترک کر کے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔“

پرویز خاموش ہو کر کینپٹن حمید کو گھورنے لگا تھا جو دروازے میں کھڑا مضحکہ انداز میں ہاتھ ہلا ہلا

کر رہا تھا۔

”پھر سندباد نے صندوق پیش کیا جس میں صندوق کی شہزادی بیٹھی لوڈ و کھیل رہی تھی۔“

”میں جانتا تھا کہ کوئی میری کہانی پر یقین نہیں کرے گا۔“ پرویز نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”دس بجے تک سعیدہ رحمان کو گھر پہنچ جانا چاہئے مسٹر پرویز۔“ حمید گھڑی دیکھتا ہوا بولا۔

”مجھے علم ہے کہ قاسم آپ کے دوستوں میں سے ہے۔“ پرویز غرایا۔ ”کیس غلط آدمیوں کو دیا

گیا ہے۔“

”اور اب آپ اُسے صحیح آدمیوں کے سپرد کرنا نہیں گے۔ کیوں مسٹر پرویز۔“ حمید نے طنزیہ لہجے

میں کہا۔

”یقیناً!۔“

”بہتر ہے تشریف لیجائیے۔“ حمید بولا۔

”نہیں!۔“ فریدی نے آہستہ سے کہا۔ ”آپ کی کہانی پر یقین کیا جاسکتا ہے مسٹر پرویز۔“

”کیا جائے۔۔۔ یا نہ کیا جائے۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے۔“

”لیکن واقعے کی رپورٹ تو آپ ہی کی طرف سے دی گئی تھی۔“ فریدی نرم لہجے میں بولا۔ ”اس

لے آپ کو پرواہ ہونی چاہئے۔“

”کینپٹن حمید میرا مضحکہ اڑا رہے ہیں۔“

”آپ اب غسل کیجئے۔ یہ کپڑے اتاریئے۔ حمید انہیں اندر لے جاؤ۔ جب یہ غسل کر لیں تو انہیں

اُس کمرے میں لے جاؤ جہاں شرابوں کا اسٹاک رہتا ہے۔ الماریوں کی کنجیاں ان کے حوالے کر دو۔

جتنی دل چاہے نہیں۔“

”میں نہیں سمجھا۔ آخر آپ چاہتے کیا ہیں۔“ پرویز نے بوکھلا کر پوچھا۔

”کیا آپ نے یہ سوال ان لوگوں سے بھی کیا تھا۔“

”کیا تھا۔“

”کیا جواب ملا تھا۔“

”کچھ بھی نہیں۔“

”لہذا آپ بے چوں و چرا وہی کیجئے جو آپ سے کہا جا رہا ہے۔“

”میں پاگل ہو جاؤں گا۔“ پرویز بڑبڑایا۔

”پاگل ہو جانے کے بعد بھی اگر آپ اس الزام سے گردن بچا سکیں تو مجھے حیرت ہوگی۔“ فریدی

نے کہا۔ ”عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ سعیدہ رحمان کے اغواء کا تعلق آپ ہی کی ذات سے ہے اور

اگر یہ بے گئی کہانی اخبارات میں آجائے تو پھر کیا ہوگا۔ آپ جانتے ہیں۔“

”میں جانتا ہوں۔ اسے کوئی بھی باور نہ کرے گا۔“

”اس لئے یہ کہانی اخبارات میں ضرور آئے گی۔“

پرویز خاموشی سے فریدی کو گھورتا رہا۔ اب تو سچ سچ اُس کی آنکھوں سے دیوانگی سی جھلکنے لگی تھی۔

حمید بھی تھیرا نہ انداز میں فریدی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا رویہ اُس کیلئے کسی معصے سے کم نہیں تھا۔

”اور آپ.....!“ فریدی ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”علانیہ لوگوں سے یہ کہتے پھریں گے کہ اس اغواء کا

تعلق خان بہادر عاصم کے علاوہ اور کسی سے نہیں ہو سکتا۔ جائیے! غصہ کیجئے۔“

## چیلنج

دن بھر کی تھکن کے باوجود بھی حمید نیا گرہ میں بڑی شاندار اسکیننگ کر رہا تھا۔

اس تھکن کے عالم میں وہ کسی تفریق گاہ کا رخ ہرگز نہ کرتا لیکن اُسے تو ایسا محسوس ہوا تھا جیسے وہ خود

پاگل ہو جائے گا لہذا اُس جتنی انتشار سے پیچھا چھڑانے کے لئے اُسے نیا گرا ہوٹل کا رخ کرنا پڑا۔ اس

جتنی انتشار کا باعث فریدی ہی تھا۔

اُس نے پرویز کو شراب پلائی اور اس دوران میں اُسے خان بہادر عاصم کے خلاف بھڑکا رہا۔

پرویز نے نشے کے عالم میں کہا کہ وہ عاصم کو قتل کر دے گا۔ اس پر فریدی نے اُسے مشورہ دیا کہ اس کے

بجائے اُسے عاصم کی بے عزتی کرنی چاہئے۔ طریقہ کار یہ تجویز کیا کہ وہ سڑک پر کھڑا ہو کر اس کا

کمپاؤنڈ میں پھرا کر اُسے اور ساتھ ہی سعیدہ رحمان کو باہر نکالنے کا مطالبہ بھی کرتا رہے۔

پرویز نے ہامی بھری اور حمید اُسے کار میں بٹھا کر خان بہادر عاصم کی کوشی کے قریب چھوڑ آیا۔ لیکن

نیا مدیکھنے کے لئے وہ وہاں رک نہیں سکتا تھا۔

پھر اُسے ایک ہی گھنٹہ بعد اطلاع ملی کہ عاصم رائل لے کر باہر نکل آیا تھا۔ لیکن لوگوں نے یہ کہہ

کر سچ بچاؤ کر دیا کہ پرویز نشے میں ہے۔ ویسے عاصم نے پولیس ضرور طلب کر لی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس

کے بعد پرویز کو یقینی طور پر حوالات ہی نصیب ہوئی ہوگی۔ لیکن نہ جانے کیوں پرویز نے یہ نہیں ظاہر کیا

کہ اُس نے فریدی کے مشورے پر عمل کیا تھا۔

حمید لاکھ سمارتا رہا کہ فریدی کم از کم اس حرکت کا مقصد تو بتا ہی دے لیکن اُس کے کان پر جوں

تک نہ رہ سکی۔

آخر حمید نیا گرا کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ تنہا تھا۔ کوئی ایسا ساتھی بھی نہیں مل سکا تھا جس سے

ڈنی کو فٹ ہی دور کرنے میں مدد ملتی۔ لہذا اس نے اسکیننگ شروع کر دی۔ وہاں شاید صرف وہی تنہا

اسکیننگ کر رہا تھا ورنہ عموماً جوڑے ہی ریکریشن ہال کے فرش پر تیرتے نظر آتے تھے۔

وہ اس طرح تنہا اسکیننگ کرنے میں بھی بڑی بوریت محسوس کر رہا تھا لیکن کرتا بھی کیا۔ اُس کے

گرد و پیش سریلے قہقہے فضا میں لہرا رہے تھے۔ کبھی کبھی نسوانی چیخیں آ کر کسرا سے ہم آہنگ ہوتیں اور پھر

قہقہوں میں تبدیل ہو جاتیں۔

پہلا راؤ بند ختم ہو گیا۔ حمید گیلری میں آ بیٹھا۔ وہ بہت شدت سے بور ہو رہا تھا اسے کہیں بھی کوئی

”لاوارث“ لڑکی نظر نہ آئی جس سے وہ اپنا پارٹنر بننے کی درخواست کر سکتا۔

وہ آج بہت زیادہ تھک گیا تھا۔ پچھلی رات کی نیند اب بھی اُس پر اُدھار تھی کیونکہ دن میں بھی دو

گھنٹے سے زیادہ نہیں سو سکا تھا۔

اسکی میز کے قریب بھی تین لڑکیاں تھیں مگر بیکار کیونکہ ان کے ساتھ تین مرد بھی تھے۔ حمید آنکھیں

بند کر کے کرسی کی پشت گاہ سے ٹک گیا۔ لیکن جلد ہی اُس کے کان اُن تین جوڑوں کی گفتگو کی طرف لگ

گئے۔ تذکرہ سعیدہ رحمان کا تھا۔ لڑکیاں اُس کی خوش قسمتی اور بد نصیبی پر رائے زنی کر رہی تھیں۔

”یہ کام پرویز ہی کا ہے۔“ مرد نے کہا۔

”کسی کی بھی حرکت ہو۔ میں اسے فضول سمجھتا ہوں۔“ دوسرا بولا۔ ”اس حرکت سے اُسے کوئی

فائدہ نہیں پہنچے گا۔“

”میں سعیدہ کو بہت قریب سے جانتی ہوں۔“ ایک لڑکی نے کہا۔ ”وہ بہت ضدی اور خود سر ہے۔“

ایک بار اُس نے جیمس اینڈ بارٹلے کے اکاؤنٹ پر پیپر ویٹ کھینچ مارا تھا لیکن اس کے باوجود بھی اس کی ملازمت بحال رہی تھی۔

”کیوں.....؟“ ایک نے پوچھا۔

”دراصل غیر اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔“

”کیوں.... کیا یہ حرکت اُس کے کسی پرانے دوست کی نہیں ہو سکتی۔“ ایک مرد نے کہا۔

”ہو سکتی ہے۔ میں بھی اُس آفس میں کچھ دن کام کر چکی ہوں۔ لیکن وہاں کی غنڈہ گردیوں سے

تنگ آ کر میں نے ملازمت ترک کر دی تھی۔ وہاں کئی بڑے آدمی ہیں۔ خصوصیت سے ایک آدمی.... آر تھر.... یہ ایک دیسی عیسائی ہے۔ فلم ایکٹروں کے سے انداز میں رہتا ہے۔ کچھ گا بھی لیتا ہے سعید سے اس کی بہت گہری دوستی تھی۔“

”اوہ.... ہٹاؤ۔“ ایک مرد ہاتھ ہلا کر بولا۔ ”ہمیں اس کو اس سے کیا سرکار۔ سعید تم سے زیادہ حسین نہیں ہے۔“

دوسرے راؤنڈ کے لئے موسیقی شروع ہو گئی۔ حمید نے پھر اسکیٹ پہننے اور نیچے فرش پر اتر گیا۔ ہال کے تین چکر لگانے کے بعد اُسے ایک لڑکی نظر آئی یہ بھی تنہا اسکیٹنگ کر رہی تھی۔ ایک دہلی پتلی اور کالی لڑکی۔ اُس کے چہرے پر گہرے سرخ ہونٹ ایسے لگ رہے تھے جیسے کسی تریوز میں شکاف دے کر اُس کی اندرونی سرخی تھوڑی سی جگہ پر ابھار دی گئی ہو۔

حمید نے سوچا چلو یہی سہی۔

وہ ایک بار اُس کے قریب سے بہت تیزی سے گذرا اور اس انداز میں جیسے اس سے ٹکرا جانے کا ارادہ رکھتا ہو۔ لڑکی اُسے دور تک گھورتی چلی گئی۔ حمید اس پکر میں تھا کہ کسی بار وہ خود ہی اُسے اپنا ہاتھ پیش کرے۔

تین بار وہ اُس کے قریب سے گذرا اور چوتھی بار اس طرح چڑھ دوڑا جیسے سچ چمکرا جائے گا۔ لڑکی نے سچ کر ٹکنا چاہا لیکن گڑباز گئی۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ بے بسی سے ہلائے۔

”اوہ.... سنہیلے۔“ حمید اُس کے دونوں ہاتھ پکڑتا ہوا بولا۔ وہ دور تک اُس کے ساتھ تیرتی چلی گئی۔

حمید نے اُس کے ہاتھ پھر نہیں چھوڑے۔ لڑکی قہقہے لگاتی رہی۔ اُس کی آواز بڑی سریلی تھی۔ اتنی

سر آہر حمید اُس کی شکل دیکھے بغیر آواز سنتا تو مہینوں صرف دیکھ ہی لینے کے پکر میں گذر جاتے۔ وہ دونوں خاموشی سے اسکیٹنگ کرتے رہے۔ حمید کا چہرہ نہ جانے کیوں بالکل سپاٹ نظر آنے لگا تھا اور آنکھیں پتھرائی ہوئی سی تھیں۔ ویسی ہی جیسی اندھوں کی ہوتی ہیں۔

چونکہ حمید نے ابھی تک اُس سے گفتگو نہیں کی تھی اس لئے لڑکی شاید اُس سے بات کرنے میں ہچکچا رہی تھی۔

”آپ بہت اچھی اسکیٹنگ کرتے ہیں۔“ لڑکی نے کچھ دیر بعد کہا۔

”جی.... اوہ.... ہاں.... پتہ نہیں کیسی کرتا ہوں۔ سب یہی کہتے ہیں۔“

”میں تو ڈر گئی تھی کہ کہیں آپ مجھے گرانہ دیں۔“

”اوہ بعض اوقات غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ آپ سچ چمک کر پڑی ہوتیں۔ میں نے یک بیک یہ محسوس کیا تھا۔“

”لیکن آپ نے سنبھال لیا۔ شکریہ۔“

”شکریہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر ایک اندھا کسی کے کام آسکے تو اُسے خوشی ہوگی۔“

”اندھا۔“ لڑکی نے حیرت سے کہا۔ ”میں نہیں سمجھی۔“

”میں اندھا ہوں۔“ حمید ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”میں خود کو محسوس کر سکتا ہوں دیکھ نہیں سکتا۔“ لڑکی ہنسنے لگی۔

”اوہ.... شاید آپ کو یقین نہیں آیا۔ جو لوگ مجھے نہیں جانتے وہ اسی طرح ہنسنے لگتے ہیں۔ وہ سوچتے ہوں گے کہ کوئی اندھا اسکیٹنگ کیسے کر سکتا ہے۔ آپ بھی یہی سوچ رہی ہوں گی لیکن میں آپ کی حیرت رفع کر سکتا ہوں۔ مجھے آپ دکھائی دیتی ہیں مگر ایک پر چھائیں کی طرح زرد رنگ کے پس منظر میں ایک تاریک پر چھائیں۔ اس وقت میرے گرد و پیش بے شمار پر چھائیاں بھاگ دوڑ کر رہی ہیں۔ لیکن میں یہ نہیں بتا سکتا کہ اُن کے خدو خال کیسے ہیں۔“

”آپ سچ کہہ رہے ہیں۔“

”میں ہمیشہ سچ بولتا ہوں۔“ حمید نے بھرائی ہوئی غناک آواز میں کہا۔

”کیا ہمیشہ سے آپ کی آنکھیں ایسی ہی ہیں۔“

”نہیں چندہ سال کی عمر تک میں نے دنیا دیکھی ہے۔ اس کے بعد اچانک بیمار پڑا اور یہ حالت



ہوگی۔ اب ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ چالیس سال کی عمر میں آپریشن ہو سکے گا۔ اُس وقت تک مجھے تارک رہنا ہے۔ اسکیٹنگ سے مجھے عشق ہے۔ دس سال کی عمر سے اسکیٹنگ کرتا آیا ہوں۔“

”آپ یہاں تک تنہا آتے ہیں۔“ لڑکی نے پوچھا۔

”کبھی تنہا آتا ہوں اور کبھی ایک نوکر ساتھ ہوتا ہے۔ میں چل سکتا ہوں لیکن روشنی ہی میں اندھیرے میں ایک قدم بھی نہ چل سکوں گا۔“

”میرا دل کڑھتا ہے آپ کے لئے۔“

”آپ بہت اچھی ہیں کاش میں آپ کو دیکھ سکتا۔“

لڑکی کچھ نہ بولی اور پھر یہ راؤنڈ بھی ختم ہو گیا۔ حمید ایک کنارے کھڑا ہو کر چاروں طرف سرگھما رہا۔ پھر آہستہ سے بڑبڑایا۔ ”بائیں طرف کی گیلری میں.... چھوٹی میز۔“

”کیا میں آپ کا ہاتھ پکڑ لوں۔“ لڑکی نے پوچھا۔

”نہیں بس میرے ساتھ چلئے۔ میرے ساتھ بیٹھے۔ اندھے کو کوئی بھی منہ لگانا پسند نہیں کرتا۔“

”چلئے! میں بیٹھوں گی آپ کے ساتھ۔“

وہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر گیلری میں لے آئی اور چھوٹی میز پر وہ دونوں بیٹھ گئے۔

وہ لڑکی ایسی ہی بد صورت تھی کہ حمید مستقل طور پر اندھا بنا رہنا چاہتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اُسے

آدمی کی فطرت پر غصہ آ رہا تھا۔ آدمی جو تنہا نہیں رہنا چاہتا۔ تنہائی رفع کرنے کے لئے کوئی بھی ل

جائے خواہ بعد کو وہ آدمی کے بجائے ٹین کانستری کیوں نہ ثابت ہو۔

”آپ کے گھر میں اور کون کون ہے۔“ لڑکی نے پوچھا۔

”کتے.... بلیاں.... پرندے اور ملازمین۔“

”والدین۔“

”نبرا سکا میں ہیں۔“ حمید جھنجھلا کر بولا۔ ”پاپا آؤں کریم پر ریسرچ کر رہے ہیں اور می پروڈ

اطفال کے ٹیننگ لے رہی ہیں۔“

”بھائی بہن۔“

”پتہ نہیں۔ اب اس تذکرے کو ختم کیجئے۔“

”آپ مجھے بہت دیر سے بیوقوف بنا رہے ہیں۔“ لڑکی ہنسنے لگی۔

”آپ نے کم بیوقوف بنایا ہے مجھے۔“ حمید اسکیٹس اتارتا ہوا بولا۔ اُسے الجھن ہونے لگی تھی اور

اب وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔

”میں نے کیا بیوقوف بنایا ہے۔“

”آپ کیا بیوقوف بنائیں گی۔ بیوقوف یا عقل مند پیداؤں ہو کر تے ہیں۔“

”تو آپ اندھے نہیں ہیں۔“

”آپ خود ہوں گی اندھی۔“ حمید نے کچھ ایسے لہجے میں کہا کہ لڑکی ہکا بکا رہ گئی۔ پھر اُس نے

جھپٹے ہوئے انداز میں ہنسا شروع کر دیا۔ پھر حمید بھی ہنسنے لگا اور اُس نے کہا۔ ”جو لڑکیاں مجھے منہ

چڑھاتی ہیں اُن سے میں اسی طرح بدلہ لیتا ہوں۔“

”میں نے کب منہ چڑھایا تھا۔“ لڑکی بھی جھنجھلا گئی۔

”چڑھایا تھا.... میں اندھا نہیں ہوں۔“

”آپ کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ لڑکی نے کہا اور میز سے اٹھ گئی۔ حمید اُسے جاتے دیکھتا رہا۔

وہ اب اُسے افسوس بھی ہو رہا تھا کہ اُس نے ایک بد صورت لڑکی کا دل توڑ دیا۔ لیکن پھر یہ سوچ کر

ضمیر کا بوجھ ہلکا ہو گیا کہ اگر وہ خود بد صورت ہوتا تو کوئی کافی، لنگڑی، لولی لڑکی بھی اُسے لفٹ دینا پسند نہ

کرتی۔

پھر اب وہ کیا کرے.... کہاں جائے.... نیند سے تھکا ہوا ذہن تفریح سے بھی بہت جلد بیزار ہو جاتا

ہے۔ لیکن نیند کہاں، نیند کی تلاش میں گھر ہی کی راہ لی جاسکتی تھی اور گھر پر موت تو آسکتی تھی مگر نیند....

کبھی نہیں.... جب تک اُس کے کمرے میں فون موجود تھا وہ سو نہیں سکتا تھا۔

اُس نے دو چار اوٹ پٹاگ قسم کی گالیاں اپنے مقدر کو دیں اور وہاں سے اٹھ گیا۔ وہ ٹیکسی پر

یہاں تک آیا تھا۔ لہذا اب اُسے کسی ایسی ٹیکسی کا انتظار کرنا تھا جو یہاں خالی ہو کر شہر کی طرف واپس

جائے۔ نیا گره شہر سے تقریباً چھ یا سات میل کے فاصلے پر تھا۔

یہاں ٹیکسیاں کمپانڈ میں نہیں داخل ہو سکتی تھیں۔ لہذا حمید کو پچانک پر آ جانا پڑا۔ دور تک سڑک

ویران پڑی تھی۔

حمید نے پاپ میں تمباکو بھرتے ہوئے ایک ٹھنڈی سانس لی اور خلاء میں گھورنے لگا۔



کار کی ہیڈ لائٹس کی روشنی دور تک سڑک پر پھیل رہی تھی اور کار کے اندر اندھیرا تھا۔ باہر سے دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس میں کتنے آدمی ہوں گے۔ ویسے بھی رات کافی تاریک تھی۔ اُس آسمان میں بادل نہ ہوتے تو تاروں کی چھاؤں بڑی خوشگوار ہوتی۔

”اوہو..... یہ کون تھا.... ذرا آہستہ چلو۔“ کسی نے کہا۔ ”اور گاڑی کو پھر بائیں جانب تھوڑا سا ترچھا کرو۔“

ہیڈ لائٹس کی روشنی درختوں کے تنوں سے رینگ کر نیا گرا کے پھاٹک پر پڑی اور پھر اُسی آدمی کی آواز آئی۔ ”بلاشبہ وہی ہے۔“

”کون؟“ کسی دوسرے سوال کیا۔

”کمپنشن حید.... آج اس کا یہاں کیا کام۔“

”اوہ.... تو کیا... تو انہیں علم ہے کہ...!“

”اگر ہے تو کیا... نہیں ہے تو کیا۔ یہ لوگ ذہن ضرور ہیں مگر... اے... کار آگے نکال لے چلو۔“ کار نیا گرا کے پھاٹک کے سامنے سے گزر گئی۔

کچھ دور چلنے کے بعد کار کوادی گئی اور کسی نے کہا۔ ”ڈکسن! تم دیکھو! کیا قصہ ہے۔“

ایک آدمی کار سے اترا چند لمحے کھڑا نیا گرہ کے پھاٹک کی طرف دیکھتا رہا پھر چل پڑا۔ وہ حید کے قریب ہی سے گزر کر پھاٹک میں داخل ہوا تھا۔ وہ کسی مغربی ملک کا باشندہ تھا۔

حید نے اُس کی طرف توجہ نہ دی۔ اس دوران میں نہ جانے کتنے اُس کے قریب سے گزر کر پھاٹک میں داخل ہوئے تھے۔

وہ غیر ملکی آگے بڑھتا چلا گیا اور پھر شائد اندر داخل ہونے ہی والا تھا کہ اُس کے قریب سے ایک گزرنے والے نے اُسے دھکا دیا.... وہ اس توقع پر اس کی طرف مڑا کہ شائد اب وہ معذرت کرے گا لیکن معذرت کرنے کی بجائے وہ سانپ کی طرح بھٹکھا۔

”چپ چاپ میرے ساتھ چلو ورنہ میرے جیب میں پڑے ہوئے ریوالتور کارخ تمہاری طرف ہے اور ایسی صورت میں اگر انگلی بھی ٹریگر پر نہ ہو تو میں خود کو چڑی مار سمجھوں گا۔“

اُس کو دھمکانے والا بھی سفید قام ہی تھا.... اس نے پھر کہا۔ ”سیدھے چلو۔“

کار سے اترنے والا چپ چاپ دوسری طرف مڑ گیا۔ اُسکے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ اوپر منزل کے زینوں کے قریب پہنچ کر دھمکانے والا بولا۔ ”اوپر.... ہاں ٹھیک ہے سمجھ دار آدمی معلوم ہوتے ہو۔“

دونوں زینے طے کرنے لگے۔ دھمکانے والا اُس کے برابر ہی تھا اور اب اُس کے جیب میں پڑے ہوئے ریوالتور کی نال دوسرے آدمی کے پہلو سے لگی ہوئی تھی۔

”آج موسم کل سے بہتر ہے۔“ اس نے کچھ اس انداز میں کہا جیسے دوسرے آدمی کو صرف یہی اطلاع دینے کیلئے اوپر لے جا رہا ہو۔

کار سے اترنے والا کچھ بولے بغیر زینے طے کرنا رہا۔ اوپر پہنچ کر اسے بائیں جانب مڑنے کو کہا گیا۔ اُس نے بے چون و چرا تعمیل کی۔ پھر وہ ایک دروازے کے سامنے رک گئے۔

دھمکانے والے نے آہستہ آہستہ دروازے پر دستک دی اور دروازہ اندر سے کھول دیا گیا۔

کار سے اترنے والے کو اندر دھکا دیتے ہوئے کہا گیا۔ ”شکار۔“

کمرے میں تین آدمی تھے۔ ”شکار“ کو دیکھ کر وہ کھڑے ہو گئے۔ یہ بھی غیر ملکی ہی تھے۔

”آہا.... یہ تو ڈکسن ہے۔“ ایک نے شکار کو نیچے سے اوپر تک دیکھتے ہوئے کہا۔ ”فنج کا ساتھی۔“

”یہ نہیں تم لوگ کس غلط فہمی میں مبتلا ہو۔“ ڈکسن بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”ہم غلط فہمی ہی میں مبتلا ہوں گے۔“ دوسرا آدمی بولا۔ ”لیکن تم یہ ضرور بتاؤ کہ فنج کہاں ہے۔“

”میں کسی فنج کو نہیں جانتا۔“

”تمہاری لاش بھی کسی کو نہ مل سکے گی۔“ ایک آدمی بولا۔

”تم لوگ خواہ مخواہ ایک امن پسند آدمی سے الجھ رہے ہو۔“ ڈکسن نے کہا۔

”اس کے کپڑے اتار کر ٹھنڈا پانی ڈالو۔“ ایک آدمی نے مشورہ دیا۔

ٹھیک اُسی وقت دروازے پر کسی نے دستک دی۔ وہ لوگ چونک کر مڑے ہی تھے کہ دروازہ کھلا اور ایک بہت لمبا آدمی جھک کر اندر داخل ہوا۔ شائد وہ باہر سے قفل کھول کر اندر آیا تھا کیونکہ ڈکسن کے اندر آ جانے پر دروازہ مقفل کر دیا گیا تھا۔ لمبے آدمی نے اپنے اوپر کوٹ کا کالر اٹھا رکھا تھا۔ اسلئے اس کا چہرہ صاف نہیں نظر آ رہا تھا۔ ہاتھ میں ریوالتور تھا جس کی نال اُن لوگوں کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

”فنج حاضر ہے دوستو۔“ اُس نے چہیتی ہوئی سی آواز میں کہا۔

ہیں حرکت میں آگئی۔ محکمہ سرانصرسانی سے لیڈی انسپکٹر رکھا اور لیفٹیننٹ سنگھ جائے واردات پر پہنچے۔  
تین آدمیوں کو طبی امداد کے لئے وہاں سے ہٹایا جا چکا تھا۔ البتہ لاش اب تک وہیں پڑی تھی اور  
پیس ہاسپل کا انچارج اُس کے قریب موجود تھا۔

اُس نے اُسے بتایا کہ موت کسی زہریلی گیس کی بناء پر واقع ہوئی تھی۔  
رکھا اور سنگھ نے کمرے کا جائزہ لیا۔ سارے صندوق کھلے پڑے تھے۔ اکثر کا سامان بھی فرش پر  
بکھرا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد انہوں نے منیجر کو طلب کیا۔

”اس واقعہ کی اطلاع آپ کو کس طرح ہوئی تھی؟“ رکھا نے اُس سے پوچھا۔  
”کوئی صاحب ملنا چاہتے تھے۔ اُن کی کال آئی تھی کمرہ نمبر ۵۳ کے لئے۔ کمرہ نمبر ۵۳ سے سلسلہ  
ملا دیا۔ کچھ دیر بعد ان صاحب نے آپریٹر کو مخاطب کر کے کہا کہ کمرہ نمبر ۵۳ سے جواب نہیں مل رہا۔  
ایک ویئر اُس کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے اوپر گیا اور اُس نے دروازہ کھلا ہوا دیکھا۔ ایک  
آدی آدھا کمرے کے اندر اور آدھا باہر پڑا ہوا تھا۔

”قریب وجوہ کے کسی آدی نے کسی غیر معمولی واقعہ کی اطلاع نہیں دی تھی؟“ سنگھ نے پوچھا۔  
”نہیں جناب! میرا خیال ہے کہ اُس آدی نے ویئر کے پہنچنے سے کچھ ہی دیر قبل دروازہ کھول کر  
باہر نکلنے کی کوشش کی تھی۔“

”یہ کب سے یہاں تھے۔“  
”تقریباً دو ماہ سے۔ دراصل کمرہ تو ایک ہی آدی نے لیا تھا۔ لیکن پھر تین آدی اور آگئے تھے۔“  
”کیا یہاں کا یہی قاعدہ ہے کہ ایک کمرے میں.... مگر ٹھہرے۔ یہاں مسہری تو ایک ہی ہے۔“  
سنگھ نے حیرت ظاہر کی۔

”بقیہ آدی شاید فرش پر سوتے تھے۔“ منیجر بولا۔  
”کیا نیا گرا جیسے بڑے ہوٹلوں میں یہ بھی ہوتا ہے۔“  
”نہیں جناب ہوتا تو نہیں ہے۔ مگر مجبوری.... یہ لوگ اسی پر مصر تھے کہ ایک ہی کمرے میں  
ریں گے۔“

”کیا یہ حفظانِ صحت کے قوانین کی خلاف ورزی نہیں ہے۔“  
منیجر کچھ نہ بولا۔

”فنج....!“ چاروں نے اُسے نیچے سے اوپر تک دیکھ کر قہقہے لگائے۔  
”تم شاید اس معجزے پر ہنس رہے ہو۔“ لمبے آدی نے سر دلچے میں کہا۔ ”فنج تو ننھا سا آدمی  
تھا.... کیوں؟ اچھا ادھر دیکھو۔“

اُس نے اپنے کوٹ کا کالر گرا دیا اور جو چہرہ روشنی میں آیا وہ فنج کے علاوہ اور کسی کا نہیں ہو سکتا  
تھا۔ چھوٹا سا چہرہ جس پر لاتعداد جھریاں تھیں۔

”تم اپنا ہاتھ جیب کی طرف لے جا رہے ہو۔ یہ بُری بات ہے۔“ لمبے آدی نے کہا۔ ”ہاتھ اوپر  
اٹھائے رکھو اور تم ڈکسن کمرے کی تلاش لو۔ آج کل ہم لوگ مفلسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر  
ڈریڈ بہت دولت مند آدی ہے کیوں دوستو!“

کوئی کچھ نہ بولا۔ ڈکسن نے کمرے میں رکھے ہوئے سوٹ کیس کھولنے شروع کر دیئے۔ پندرہ  
منٹ کے اندر ہی اندر کمرے کے وسط میں پڑی ہوئی میز پر نوٹوں کی کئی گڈیاں نظر آنے لگیں۔ یہ سب  
بڑے نوٹ تھے۔ رقم میں چالیس ہزار سے کم نہ رہی ہوگی۔

”انہیں میری جیبوں میں رکھ کر.... تم کمرے سے باہر نکل جاؤ ڈکسن۔“ لمبے آدی نے  
کہا۔ ڈکسن نے یہی کیا۔ وہ چاروں حیرت سے منہ کھولے کھڑے رہے۔ کبھی وہ لمبے آدی کا چہرہ  
دیکھتے اور کبھی اُس کے قد کا جائزہ لینے لگتے۔

”سنو دوستو!“ لمبے آدی نے انہیں مخاطب کیا۔ ”ڈاکٹر ڈریڈ جہاں کہیں بھی ہو اُسے میرا پیغام پہنچا  
دو۔ اس سے کہنا۔ فنج نے کہا تھا کہ تمہارے زوال کے دن قریب آگئے ہیں۔ ایک حقیر سا کیڑا فنج جو  
سرکس میں کام کر کے اپنا پیٹ پالتا تھا دنیا کے خوفناک ترین آدی ڈاکٹر ڈریڈ کے پرچے اڑا دے گا۔“

دفعۃً اُس کے ریوالور کی نال سے دھواں نکلا اور وہ چاروں اُس کے خطرناک نتائج سے دوچار  
ہونے کے لئے تہوارہ گئے۔

## بلیک میلر

دوسری صبح نیا گرہ کے منیجر کے لئے بڑی پریشان کن تھی جب کمرہ نمبر ۵۳ سے تین قریب المرگ  
آدمیوں کے ساتھ ایک لاش بھی برآمد ہوئی۔  
وہ تینوں اس قابل نہیں تھے کہ بیان دے سکتے۔ معاملہ چونکہ غیر ملکیوں کا تھا اس لئے آٹا فانا

ریکھانے اُسے مخاطب کیا۔ ”کیا رجسٹروں میں ان لوگوں کے اندراجات باقاعدہ طور پر ہوئے تھے۔“

”جی ہاں۔“

”پاسپورٹوں کے متعلق تفصیلات آپ کے رجسٹروں میں موجود ہیں۔“

”جی ہاں! موجود ہیں۔“

”رجسٹر منگوائیے۔“

منیجر فون کی طرف بڑھا اور ریکھا ہاتھ اٹھا کر بولی۔ ”نہیں یہاں آپ کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔“

”اوہ.... معاف کیجئے گا مجھے خیال نہیں تھا۔ میں خود ہی لا رہا ہوں رجسٹر۔“

انہوں نے اسے جانے سے نہیں روکا۔

”کیا خیال ہے؟“ سنگھ نے ریکھا سے پوچھا۔

”فی الحال کوئی رائے قائم کرنا مشکل ہی ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ یہ اپنی ہی کسی حماقت کا شکار ہوئے ہیں۔“ سنگھ نے کہا۔

”میں نہیں سمجھی۔“

”ہو سکتا ہے کہ انہوں نے کسی خطرناک قسم کی گیس سے خود ہی شغل کیا ہو۔“

”ہاں.... آں.... یہ بھی ممکن ہے۔ لیکن مجھے ابھی تک یہاں کوئی ایسی چیز نہیں نظر آئی ہے گیسوں کو مقید رکھنے کا آلہ سمجھا جاسکے۔ اگر ان کے پاس کسی قسم کی گیس تھی تو انہوں نے کس طرح اُسے محفوظ رکھا تھا۔“

”اوہو! اس کا تو خیال ہی نہیں تھا۔“ سنگھ جلدی سے بولا۔ ”تم ٹھیک کہتی ہو۔“

”تاوقتیکہ ان میں سے کوئی بیان دینے کے قابل نہ ہو جائے ہم اندھیرے ہی میں رہیں گے۔“

ریکھا بولی۔

”افسوس کہ حمید یہاں موجود نہیں ہے ورنہ اس اندھیرے سے بہت فائدہ اٹھاتا۔“ سنگھ مسکرایا۔

ریکھا کچھ نہ بولی۔ وہ اُس لاش کو گھور رہی تھی جواب بھی وہاں موجود تھی۔ البتہ ڈاکٹر جاچکا تھا۔

وہ دونوں کمرے سے راہداری میں چلے آئے۔

تھوڑی دیر بعد منیجر بھی رجسٹر سمیت آ گیا۔ لیکن اس بار وہ بہت زیادہ بوکھلایا ہوا نظر آ رہا تھا اور بن کی سانس پھول رہی تھی۔

”کیا بات ہے!“ سنگھ نے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔

”وہ تینوں بھی مر گئے جناب۔“ منیجر ہانپتا ہوا بولا۔

”ارے...!“

”جی ہاں.... ابھی ابھی اطلاع ملی ہے۔“

چند لمحے وہ خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر سنگھ نے اُس کے ہاتھ سے رجسٹر لے لیا۔ ان چاروں کے متعلق تفصیلات دیکھیں اور رجسٹر کو ریکھا کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔ ”ان کے متعلق ویزا ایکشن سے معلوم کرو۔“

ریکھا رجسٹر لے ہوئے نیچے چلی گئی۔ سنگھ پھر کمرے میں آیا اور نئے سرے سے دیکھ بھال شروع کر دی۔ اُسے دراصل اُن چاروں کے پاسپورٹوں کی تلاش تھی لیکن پندرہ یا بیس منٹ تک جھک مارنے کے باوجود بھی پاسپورٹ نہ مل سکے.... اتنے میں ریکھا بھی واپس آ گئی۔

”یہ لوگ تو فراڈ تھے۔“ اس نے کہا۔

”کیا...؟“

”میں نے ویزا ایکشن کو فون کیا تھا۔ وہاں ان لوگوں کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے مگر ہوٹل کے رجسٹر کے اندراجات کہتے ہیں کہ وہ دو ماہ پہلے کینا ڈاے آئے تھے۔“

”چلو.... جان چھوٹی!....“ سنگھ نے ایک طویل سانس لی۔

”کیوں جان کیوں چھوٹی۔“

”یہ سو فیصدی کرنل فریدی کا کیس بن گیا ہے۔ ایسے کیس ہمیں ملتے ہی کب ہیں۔“

”نہیں شائد یہ ہمارا ہی کیس ہے کیونکہ ان کے پاس سعیدہ رحمان کا کیس ہے۔“

”وہ کسی اور کوئل جائیگا۔ اُس میں کوئی خاص پیچیدگی بھی نہیں ہے۔ سیدھا سادہ اغوا کا کیس ہے۔“



کرنل فریدی بیرسٹر کیلاش ورما کے آفس میں داخل ہوا۔ بیرسٹر نے بڑی گرم جوشی سے اُسے خوش آمدید کہی اور کرسی کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔ ”تشریف رکھئے جناب! کیسے تکلیف فرمائی۔“

”سعیدہ رحمان کے سلسلے میں۔“

”یہ واقعہ میرے لئے بہت تکلیف دہ ثابت ہوا ہے۔“

”ہونا بھی چاہئے کیونکہ وہ آپ کی موکلہ تھی۔“

”صرف یہی نہیں کرل۔۔۔۔۔ وہ میری بچی تھی۔۔۔۔۔ اسکی تعلیم و تربیت میرے ہی ہاتھوں سے ہوئی تھی۔“

”اس سلسلے میں یہ نئی بات سن رہا ہوں۔ وہ کس طرح جناب؟“

”اُس کا باپ میرے یہاں منشی تھا۔ یہ بچی چھوٹی ہی تھی کہ اس کی ماں مر گئی۔ منشی نے دوسری شادی نہیں کی۔ وہ بڑا نیک آدمی تھا۔ میری بیوی نے بچی اُس سے لے لی اور ہمارے ہی بچوں کے ساتھ اُس کی پرورش بھی ہوئے لگی۔ جب وہ دس سال کی ہوئی تو بیچارہ منشی بھی چل بسا لیکن سعیدہ ہمارے ہی ساتھ رہی۔ پھر سن بلوغ کو پہنچنے پر وہ خود ہی ہم سے علیحدہ ہو گئی۔ ہمیں اس کا ملال بھی نہیں ہوا۔ ہم نے سوچا ممکن ہے ہمارے ساتھ رہنے سے اُس کے مستقبل پر کوئی برا اثر پڑے مگر وہ دن میرے لئے بڑا آسنی خیز تھا۔“

کیلاش درما کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ چند لمحے اسی انداز میں میں فریدی کی طرف دیکھتا رہا پھر کرسی کی پشت سے نکلتا ہوا بولا۔ ”وہ دن جب جیہکا کے ایک وکیل کا بیان موصول ہوا کہ سعیدہ رحمان ایک بہت ہی مالدار بیچا کی وارث قرار پائی ہے۔ کرل آپ سوچئے تو سہی کتنی حیرت انگیز بات ہے یعنی سعیدہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اُس کا وہ آوارہ گرد بیچا جو بچپن ہی میں گھر سے فرار ہو گیا تھا اُس کی اتنی بڑی خوش نصیبی کا باعث بنے گا۔“

”کبھی سعیدہ کے باپ نے بھی اپنے کسی بھائی کا تذکرہ کیا تھا۔“ فریدی نے کہا۔

”اگر کیا بھی ہو تو مجھے یاد نہیں کرل۔۔۔۔۔ لیکن سعیدہ کا بیان ہے کہ وہ اکثر اُس بھائی کا تذکرہ کیا کرتا تھا۔“

”کیا آپ اُس وکیل سے ذاتی طور پر واقف ہیں جس کا پیغام آپ کو موصول ہوا تھا۔“

”ہرگز نہیں۔ اس بات پر تو اور زیادہ حیرت بھی ہے اور پھر میں کسی بین الاقوامی حیثیت کا آدمی بھی نہیں کہ ساری دنیا کے لوگ مجھ سے واقف ہوں۔“

”پھر آپ اس سے کس نتیجے پر پہنچے ہیں۔“

”ان حالات کے پیش نظر یہی کہا جاسکتا ہے کہ کرم رحمان اپنی بھائی اور بھتیجی کے متعلق ہمیشہ تازہ

زین معلومات فراہم کرتا رہتا تھا۔ یعنی اُسے معلوم تھا کہ بھائی مرچکا ہے اور بھتیجی فلاں جگہ پر ہے۔ جس آڈن نے مجھے یہی لکھا ہے کہ کرم رحمان کے مرتب کئے ہوئے وصیت نامے کے مطابق اس کی ساری املاک سعیدہ رحمان کے نام منتقل کر دی گئی ہے۔“

”پھر رقم ملی بھی ہے اُسے۔“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ فی الحال میں ہزار روپے ملے ہیں الائیڈ بینک کے توسط سے۔ ویسے حقیقتاً یہ لڑکی ارب پتی ہو گئی ہے۔ فی الحال ایسی دشواریاں آپڑی ہیں جن کی بناء پر تھوڑا ہی تھوڑا سرمایہ اس طرف منتقل کیا جاسکتا ہے۔ ویسے اگر سعیدہ جیہکا چلی جائے تو اسے حقوق شہریت بھی مل جائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ سعیدہ کو یہی کرنا پڑے گا۔ خود جس آڈن کا بھی یہی خیال ہے کیونکہ وہاں کی حکومت اتنا بڑا سرمایہ ہرگز وہاں سے منتقل نہ ہونے دے گی۔“

”ہوں۔۔۔۔۔!“ فریدی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”کیا آپ وہ کاغذات مجھے دکھاسکیں گے۔“

”ضرور ضرور۔۔۔۔۔!“ کیلاش درما نے میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بجائی۔ چیراسی اندر داخل ہوا۔

”قریشی صاحب سے سعیدہ رحمان کا فائیل لاؤ۔“

فریدی خاموشی سے اُس کے حرکات و سکنات کا جائزہ لیتا رہا۔ چیراسی جاچکا تھا۔ کبھی کبھی کیلاش درما بھی فریدی پر ایک اچنتی ہوئی سی نظر ڈالتا اور پھر دوسری طرف دیکھنے لگتا۔

تھوڑی دیر بعد فائیل آگیا اور کیلاش نے اس میں سے کچھ کاغذات نکال کر فریدی کی طرف بڑھا دیئے۔ فریدی انہیں دیکھتا رہا پھر یک بیک اٹھتا ہوا بولا۔

”اچھا بہت بہت شکریہ۔“

وہ کیلاش درما کو حیرت زدہ چھوڑ کر باہر جاچکا تھا۔



گھر پہنچ کر اُسے معلوم ہوا کہ لیڈی انسپکٹر ریکھادیر سے اُس کی منتظر ہے۔ وہ سیدھا ڈرائیونگ روم میں چلا گیا۔

فریدی کو پہلے ہی سے علم تھا کہ وہ اور سنگھ نیا گرا کے کسی کیس کی تفتیش کر رہے ہیں۔

”میں اس وقت آپ کو تکلیف نہ دیتی۔“ ریکھانے کہا۔ ”مگر اتفاق سے یہ آپ ہی کا کیس بن گیا ہے۔“

”کیوں میرا... کیسے...!“

ریکھانے مختصر اُسے ان چار لاشوں کے متعلق بتاتے ہوئے کہا۔ ”تین ڈاکٹروں کا بیان ہے کہ ایک آدمی مرنے سے قبل بڑا بڑا تھا۔“

فریدی خاموشی سے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔

”اُس نے کہا تھا۔“ ریکھا چند لمحے خاموش رہ کر بولی۔ ”بہت لمبا ہو گیا ہے... اوہو...“ فنج بہت لمبا ہو گیا ہے۔“

”فنج...!“ فریدی آہستہ سے بولا۔ ”اگر ڈاکٹروں نے غلط نہیں سنا تو یہ سو فیصدی میرا کیس ہے۔“ فنج کا کیس اب بھی میرے ہی پاس ہے۔“

”لیکن چاروں آدمیوں کا کوئی ریکارڈ ہمارے یہاں نہیں ہے۔ ویسے ہوٹل کے رجسٹر میں جو اندراجات ہیں اُن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیسا ڈا اے آئے تھے۔“

”اُن کے سامان سے کوئی ایسی چیز بھی برآمد ہوئی جس سے ان کی اصلیت پر روشنی پڑ سکے۔“

”ایسی کوئی چیز نہ مل سکی۔“

”کیا وہ کمرہ میل کر دیا گیا ہے۔“

”جی ہاں۔“

”یہ بہت اچھا کیا۔ اب میرے لئے بھی ضروری ہو گیا ہے کہ اُسے ایک نظر دیکھ لوں۔“

”مگر اس جملے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ اوہو فنج بہت لمبا ہو گیا ہے۔“

”ممکن ہے۔ یہ ہڈیاں ہو کیونکہ فنج کے لمبے ہو جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ وہ تو غیر

معمولی طور پر پستہ قد ہے۔ میرے لئے بس اتنا ہی کافی ہے کہ مرنے والوں میں سے ایک کی زبان پر فنج کا نام آیا تھا۔“

ریکھا چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔ ”میں شروع سے دیکھ رہی ہوں کہ آپ ڈاکٹر ڈریڈ کے مقابلے میں فنج کو زیادہ اہمیت دیتے رہے ہیں۔“

”وہ میرے لئے بڑی مشکل رکھتا ہے۔ غیر معمولی صلاحیتیں رکھنے والا ایک نہایت مناسا آدمی... رہا

ڈاکٹر ڈریڈ تو وہ ایک ویسا ہی شعبہ گر ہے جیسے بارہا میرے ہاتھوں سے انجام کو پہنچے ہیں۔ وہ دراصل اتنا بھیانک نہیں ہے جتنا کہ امریکہ کی پولیس نے اُسے بنادیا ہے اور پھر ڈاکٹر ڈریڈ کے آج تک بچے

بچے کی سب سے بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اُسے امریکہ کے بڑے بڑے سرمایہ داروں کی پشت پناہی مل رہی ہے۔ وہ اُن کے لئے کام کرتا رہتا ہے۔ مگر یہ فنج مجھے سنگ ہی کی یاد دلاتا ہے اور سنگ ہی بیجرم آج تک میری نظروں سے نہیں گذرا۔“

ریکھا کچھ کہنے ہی والی تھی کہ حمید کمرے میں داخل ہوا۔

”اوہو...!“ اُس نے اتنا ہی کہا اور چپ چاپ بیٹھ گیا۔

فریدی جواب طلب نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

حمید نے بڑے بے تعلقانہ انداز میں ایک طویل انگڑائی لی اور بڑبڑانے لگا۔

”کلوکی ماں جب کلو جوان ہو جائے تو تم مجھے گولی مار دینا۔“

”میں ابھی تمہیں پتھر مار مار کر ہلاک کر دوں گی۔“ ریکھا چنچنائی۔

”یہ کیا بیہودگی ہے۔“ فریدی نے غصیلے انداز میں کہا۔

”کیا آپ لوگ مجھ سے کچھ کہہ رہے ہیں۔“ حمید چونک کر بولا۔

”چلے جاؤ یہاں سے۔“ فریدی بگڑ گیا۔

”اگر یہ حکم کم از کم ایک ہفتے کے لئے بھی ہو تو میں سر کے بل چلے جانے کی کوشش کروں گا۔ لیکن

جیس اینڈ بارٹلے کی فرم کا ایک گویا مجھے حشر تک یاد رہے گا۔“

فریدی ریکھا کی طرف متوجہ ہو گیا جو اُسے اُن چاروں کے متعلق کچھ اور بتانے لگی تھی لیکن یہ کوئی

اہم بات نہیں تھی۔ اس کا مقصد صرف اتنا ہی تھا کہ حمید وہاں سے اٹھ کر چلا جائے۔ مگر حمید عورتوں کے

معاملے میں اتنا حیا دار نہیں تھا کہ کسی کی بے رخی اُسے دکھ پہنچاتی۔ وہ نہایت اطمینان سے صوفے میں

نیم دراز اپنے پاپ میں تبا کو بھر رہا تھا۔

ریکھا اپنی گفتگو ختم کر کے خاموش ہو گئی اور فریدی حمید کو گھورنے لگا۔

پھر کچھ دیر بعد بولا۔ ”ہاں تم جیس اینڈ بارٹلے کے کسی گویے کا تذکرہ کر رہے تھے۔“

”کرتا چاہتا تھا مگر اب وہ بات ہی ختم ہو گئی۔“ حمید نے لاپرواہی سے کہا اور پاپ سلگانے لگا۔

”میں آدمیوں کا ایک کانچی ہاؤس قائم کرنا چاہتا ہوں۔“ فریدی نے ریکھا سے کہا۔

”یہ عمارت بہت موزوں رہے گی۔“ حمید نے کہا ”اور اُس کی منتظرہ اگر کوئی عورت بنائی جائے تو

تہ ہے۔“

”کیا خواہ مخواہ کو اس کرنے والے آدمی لاوارث جانوروں سے بہتر ہوتے ہیں۔“ فریدی نے  
ریکھا سے پوچھا۔

”بدر....!“ ریکھا نے براسمانہ بنا کر جواب دیا۔

حمید بڑی بے تعلقی سے پائپ پیتا رہا۔

پھر تھوڑی دیر بعد اُس نے جیب سے ایک تصویر نکالی اور اُسے فریدی کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔  
”دیکھئے کتنا بانا کا سنجیدہ نوجوان ہے۔“

فریدی نے تصویر لے لی۔ اُسے چند لمبے دیکھتا رہا پھر حمید کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔

”کیا آپ اسے پہچان سکتے ہیں۔“

”نہیں.... کیونکہ اس کی آنکھوں پر تاریک شیشوں کی عینک ہے۔“

”اور گھنی مونچھیں بھی نہیں ہیں۔“

”کیا مطلب....!“

”مطلب یہ کہ اس آدمی کی آنکھوں پر عموماً تاریک شیشوں کی عینک ہوتی ہے اور اُس نے اپنی گھنی  
مونچھیں صاف کرا دی ہیں۔“

”ٹھہرو.... تاک اور دہانے کی بناوٹ کچھ جانی پہچانی سی معلوم ہوتی ہے۔ اوہو.... یہ تو سنگرام ہے۔“  
”خیر پہچان لیا آپ نے۔“

”کیا تم نے اسے کہیں دیکھا ہے۔“

”یقیناً دیکھا ہے ورنہ اُس کی تصویر کیوں لئے پھرتا۔ یہ تصویر مجھے سعیدہ رحمان کے یہاں سے ملی  
ہے۔“

”اوہ.... تم نے اسے کہاں دیکھا ہے۔“

”جیمسن اینڈ بارتلے کے یہاں کلرک ہے۔ یہ وہی آدمی ہے جس کے متعلق سعیدہ کے ملازم نے  
بتایا تھا کہ اکثر سعیدہ اُس سے گیت سنا کرتی تھی۔ اس کا موجودہ نام آر تھر ہے۔“

”اوہ.... یہ خبر بھی میرے لئے دلچسپ ہے۔“

”سنگرام کون ہے۔“ ریکھا نے پوچھا۔

”ایک بلیک میلر جس کی تلاش پولیس کو عرصہ سے ہے۔ تلاش تو ہے لیکن آج تک اُس کے خلاف

کوئی جرم نہیں ثابت ہو سکا۔ تلاش یوں ہے کہ پولیس اس پر نظر رکھنا چاہتی ہے۔“

فریدی انہیں دہیں بیٹھا چھوڑ کر کمرے سے نکل گیا۔

”ہااا.... ریکھا مانتی ہو.... نا....!“ حمید نے قہقہہ لگایا۔ ”اب آؤ ہم تم دیو داس کے ڈائلاگ بولیں۔“



”کیا بیہودگی ہے۔“ ریکھا اٹھتی ہوئی بولی۔

”تم جانہیں سکتیں۔“

”دیکھتی ہوں کیسے روکتے ہو۔“

”اگر جاؤ تو خدا کرے تمہارے ماں باپ مرجائیں۔“

”تم خود فنا ہو جاؤ۔ تمہارا سارا خاندان۔“ ریکھا بہت زور سے بگڑی۔

”میرا خاندان تو فنا ہو چکا ہے۔ خدا کرے تمہارا سنگیتر کوڑھی ہو جائے۔“ حمید نے کچھ اس انداز

میں کہا کہ ریکھا پاگل نظر آنے لگی۔ کیونکہ وہ غصے میں بھی تھی اور اُسے ہنسی بھی آگئی تھی۔ ظاہر ہے کہ کیا  
شکل بنی ہوگی۔

حمید نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔

”میں دونوں سینڈل تم پر توڑ دوں گی۔“

”پردہ نہیں۔ میں دوسری خرید دوں گا۔ اب اتنا مفلس بھی نہیں ہوں۔“

ریکھا بے بسی سے صوفے میں گر گئی اور دانت پیس کر بولی۔ ”دروازہ کھول دو۔ میں نہیں جاؤنگی۔“

حمید نے دروازہ کھول دیا اور اُس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھتا ہوا بولا۔ ”بس میں یہ چاہتا  
ہوں کہ تم بیٹھی رہو اور میں تمہیں دیکھا کروں۔“

ریکھا کوئی جواب دینے کی بجائے اُسے گھورتی رہی۔

”اچھا مذاق ختم۔“ حمید نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تمہیں دراصل اس لئے روکا

ہے کہ ہم لوگ کسی دوسرے کے پابند کیوں ہوں۔ مطلب یہ کہ اگر ہم فریدی صاحب سے الگ ہی رہ

کر کوئی کیس پنہا سکیں تو کیسی رہے۔ مثلاً ڈاکٹر ڈریڈ ہی کا معاملہ لے لو۔“

”تم ڈاکٹر ڈریڈ کو پنہاؤ گے۔“ ریکھا ہنس پڑی۔

”کیوں.... کیا ہوا۔“

ریکھا کچھ کہنے والی تھی کہ ایک ملازم نے اندر آ کر ایک وزیٹنگ کارڈ پیش کیا۔

”ارے یہ کہاں.... آ مرا“ حمید نے برا سامنہ بنا کر کہا۔

”کون ہے....!“ ریکھانے پوچھا۔

”قاسم....!“ حمید نے کہا پھر نوکر سے بولا۔ ”بھیج دو۔“

کچھ دیر بعد قاسم کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ٹھک گیا۔ غیر متوقع طور پر ریکھا کو وہاں دیکھ کر وہ گڑبڑا گیا۔

”ارے آؤ نا....!“ حمید نے ہونٹ سکڑ کر کہا۔

”آداب عرض۔ آداب عرض۔“ قاسم بوکھلاہٹ میں ریکھا کو جھک جھک کر سلام کرتا ہوا ایک صوفے میں ڈھیر ہو گیا۔

”کیا بات ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”حق.... کچھ بھی نہیں۔“

”کچھ تو ہے۔ تمہارے معاملات بہت سنگین ہوتے جا رہے ہیں۔“

”میرے ٹھیکے سے۔“ قاسم کو یک بیک غصہ آ گیا۔ ”میں اب اُسے سالے کو قتل ہی کر دوں گا۔“

”کے....!“

”پرویز.... کو.... دن بھر.... ٹرن ٹرن ٹرن.... اور گالیاں.... دن بھر گالیاں سننی پڑتی ہیں۔“

”کیا بات ہوئی۔ میں کچھ نہیں سمجھا۔“

”سمجھو....!“ قاسم غصے میں مکا ہلا کر بولا۔ ”وہ دن بھر مجھے فون پر گالیاں دیتا رہتا ہے۔“

”اوہو.... تو کیا اُسے ضمانت پر رہا کر لیا گیا ہے۔“

”ہاں.... اور اب وہ کبھی رہا نہ ہو سکے۔ وہاں سے تو نکل ہی نہ سکے گا۔“

”کہاں سے۔“

”قبر سے۔“

”تم ایک ذمہ دار آفسر کے سامنے گفتگو کر رہے ہو۔“ حمید آنکھیں نکال کر بولا۔

”فریدی صاحب کہاں ہیں۔“

”وہ جی ہوا ہوا تشریف لے گئے ہیں۔ تم اپنا مطلب بیان کرو۔“

”میں یہی کہنے آیا ہوں کہ پرویز کو قتل کر دوں گا۔“

”مگر چھانی کوئی نگری سی لڑکی نہیں دے گی۔“

”اے تم میرا.... مذاخ نہ اڑاؤ ورنہ بھگتا دوں گا۔“ قاسم نے کہا اور اچانک چونک کر ریکھا کی

طرف دیکھنے لگا۔ اس دوران میں شائد وہ بھول گیا تھا کہ وہاں کوئی عورت بھی موجود ہے۔

”معاف کیجئے گا۔“ وہ گھکھکیا۔ ”میں غصہ میں تھا۔“

”ہونا ہی چاہئے۔“ ریکھانے مسکرا کر کہا۔ ”آپ کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے۔“

”مگر ان لوگوں کی سمجھ میں تو نہیں آتا۔“

”کیا سمجھ میں نہیں آتا۔“ حمید نے پوچھا۔

”سمجھ میں آتا ہوتا تو وہ چھوڑا جاتا۔“

”ارے بھی ضمانت پر چھوٹا ہے۔“

”کیوں چھوٹا ہے۔“

”قانون....!“

”قانون کی ایسی کی تیسی۔ جو تم لوگ چاہتے ہو وہی قانون ہے۔“

”اچھا چلو یہی سہی۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ فون پر تمہیں گالیاں دیتا رہے۔“

”سن رہی ہیں آپ۔“ قاسم نے ریکھا کو مخاطب کیا۔

”ارے کیا سن رہی ہوں۔“ ریکھانے ہنسی ضبط کر کے سنجیدگی اختیار کرنی چاہی۔ پھر بولی۔ ”یہ تو

آپ کے پیچھے ہی پڑے رہتے ہیں۔“

”جی ہاں۔“

”آپ کے منہ پر تو تعریف بھی کر دیتے ہیں۔ مگر پیٹھ پیچھے.... کچھ نہ پوچھے.... کیا کہتے ہیں۔“

”نہیں.... بتائیے.... بتائیے۔“ قاسم حمید کو گھورتا ہوا بولا۔

حمید سمجھ گیا کہ ریکھا اس وقت چوکے گی نہیں ہو سکتا ہے سر پٹھوں کی نوبت آ جائے لیکن وہ اس

طرح اٹھنا بھی اپنی تو جین سمجھتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ریکھا بعد کو بڑی طرح اُس کا مذاق اڑاتی۔

”ہاں.... کیا کہتا ہوں پیٹھ پیچھے۔“ حمید نے بڑی دلیری سے پوچھا لیکن ساتھ ہی وہ آنکھوں سے

قاسم کی طرف بھی دیکھتا رہا تھا کہ کہیں اُس کی بے خبری میں جھپٹ ہی نہ پڑے۔



”آپ انہیں گنوار نہیں کہتے۔“

”تم گنوار کے معنی بھی جانتی ہو۔“

”قاسم صاحب! مجھ سے بہتر معنی جانتے ہیں۔“

قاسم صرف گھورتا رہا۔ اُس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔ حمید نے سوچا جادو چل گیا ہے۔ ریکھانے بھی قاسم کی حالت دیکھی اور اُس کے ہونٹوں کے کونے پھڑکنے لگے اور وہ اپنی مسکراہٹ نہ روک سکی۔

”اچھی بات ہے۔ میں دیکھ لوں گا۔“ قاسم غرایا۔ ”میں تو ابھی تق تم کو دوست سمجھتا تھا۔“

”اور ایک بار جا نگلو بھی کہا تھا۔“

”یہ خود ہوگا۔۔۔۔۔ جا نگلو۔۔۔۔۔ سالہ۔۔۔۔۔ والا۔“ قاسم آؤٹ آف کھوپڑی ہو گیا۔

حمید شٹا گیا۔ اب معاملہ بہت آگے بڑھ چکا تھا۔ اس اسٹیج پر قاسم کو کنٹرول میں رکھنے کی صرف یہی ایک صورت تھی کہ وہ خاموش رہے۔ اگر صفائی پیش کرنے کی کوشش کرتا تب بھی حالات بدتر ہی ہو سکتے تھے۔ بہتر نہیں۔ ریکھا تو اپنا وار کر چکی تھی۔

وہ خاموش بیٹھا رہا۔۔۔۔۔ اور قاسم گرجتا رہا۔۔۔۔۔ ”بڑے۔۔۔۔۔ عجب بننے ہو سالے۔۔۔۔۔ تم اپنے کو کیا سمجھتے ہو۔ جب دل چاہے سامنے آ جاؤ۔۔۔۔۔ اٹھو نا۔“

اتنے میں ایک نوکر نے آ کر حمید سے کہا۔ ”صاحب کافون ہے۔“

”اچھا“ حمید اٹھتا ہوا بولا اور چپ چاپ کمرے سے نکلا چلا گیا۔

کچھ دیر بعد قاسم نے ریکھا سے کہا۔ ”معاف کیجئے گا۔ مجھے پھر غصہ آ گیا تھا۔“

”کوئی بات نہیں۔“ ریکھا مسکرا کر بولی۔ ”مگر دیکھا آپ نے کیسا دم دبا کر چلا گیا میں غلط تھوڑا ہی کہہ رہی تھی۔“

”غصہ آ گیا تھا۔۔۔۔۔ میں مار بیٹھتا۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔!“

”کیا فائدہ۔۔۔۔۔ یہاں مارنے سے کیا فائدہ۔ کون دیکھتا۔ کسی دن بیچ سڑک پر روک کر مار بیچے۔“

بھرے بازار میں تاکہ کچھ بے عزتی بھی ہو۔ ورنہ اور نہ جانے کن کن آدمیوں کے سامنے آپ کے متعلق اسی قسم کے خیالات ظاہر کرتا رہے گا۔“

ہاں۔۔۔۔۔ یہ بات ٹھیک ہے۔“ قاسم سر ہلا کر بولا۔ پھر آہستہ سے پوچھا۔ ”آپ کا کیا خیال ہے۔“

”کہاں بے عزتی کروں اس کی۔“

”کسی ایسی جگہ جہاں اس کی جان پہچان والے موجود ہوں ورنہ کون جانے گا کہ کون پٹا۔“

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“ قاسم نے رازدارانہ انداز میں سر ہلا کر کہا۔ ”اچھی بات ہے۔ میں کہیں

نہ کہیں اسے دیکھ لوں گا۔“

”میں بھی موجود ہوں تو بہتر ہے۔“ ریکھانے کہا۔

”ضرور ضرور۔۔۔۔۔!“ قاسم مسکرا کر بولا۔ ”میں آپ کو فون کر دوں گا یا خط لکھ دوں گا نہیں تارو۔،

”وہں گا۔“

”میں خود ہی جگہ وغیرہ آپ کو بتا دوں گی۔“

”یہ تو بہت عمدہ رہے گا۔“ قاسم نے ہنسنے لگا۔

## بے نیل و مرام

فن آئی لینڈ معمول کے مطابق کافی پُر رونق نظر آ رہا تھا۔ شام کے چار بجے تھے اور یہاں تفریح

کرنے والوں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔

مگر کرنل فریدی جزیرے کے ایک ایسے حصے میں نظر آ رہا تھا جہاں کارخ شاندی کبھی کوئی کرتا رہا

ہو۔ یہاں کی زمین ناہموار تھی اور بعض جگہ بہت چوڑی چوڑی دراڑیں تھیں۔ یہاں سے تھوڑے ہی

فاصلے پر نشیب میں لہریں ساحل سے ٹکراتی تھیں۔

وہ سینے کے بل زمین پر لیٹا ہوا ایک دراڑ میں جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دراڑ تقریباً سات یا آٹھ

فٹ ضرور چوڑی رہی ہوگی اور گہرائی کا اندازہ کرنا تو مشکل ہی تھا کیونکہ نیچے تاریکی کے علاوہ اور کچھ

نہیں نظر آتا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ اٹھا اور نشیب میں اترنے لگا اور پھر وہ اُس دراڑ کے دہانے پر جا پہنچا۔ لہریں اُس

میں گھسکتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ یہاں دراڑ کی کشادگی چالیس فٹ سے کسی طرح کم نہ رہی ہوگی اور

دراڑ کے اندر جہاں تک سورج کی روشنی پہنچ سکتی تھی پانی ہی پانی نظر آ رہا تھا۔ وہ چند لمحوں کے بعد اٹھ کر

اور پھر اوپر چلا آیا۔

اب وہ جزیرے کے سب سے اونچے ٹیلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد وہ

”تم اس کی پرواہ نہ کرو۔“ فریدی نے کہا۔ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ ”قصہ دراصل یہ ہے کہ سنگرام یا آرتھر کا تعلق ڈاکٹر ڈریڈ کے گروہ سے معلوم ہوتا ہے۔“

”خدا خبر کرے۔ یہ میں نے کیا کیا۔“ حمید اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے مارتے رہ گیا۔

”تم نے کچھ نہیں کیا۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔“

”آپ ہمیشہ دوسروں کی محنت کے پھل خود ہی کھانے کی کوشش کرتے ہیں۔“

”اگر میری نیت صاف نہ ہو تو پھلوں کی گھٹلیاں حلق میں ایک جائیں لیکن ایسا آج تک نہیں ہوا۔ مجھے سیدہ کے دوستوں کی تلاش ہے۔ میں ایک ایک کو چیک کروں گا۔ لہذا سنگرام کا بھی سامنے آنا ضروری تھا۔ یہ اور بات ہے کہ تم نے اُسے چیک کر لیا۔ لیکن یہ معلوم کر لینا کم از کم تمہارے فرشتوں کے بس کی بات نہیں تھی کہ سنگرام کا تعلق ڈریڈ کے گروہ سے ہے۔“

”آپ نے کیسے معلوم کر لیا۔“

”تم کیا یہ سمجھتے ہو کہ میں اب تک سوتا رہا ہوں۔ ڈریڈ کے کم از کم پانچ آدمی میری نظروں میں ہیں۔“

”اور آپ اب تک اس فکر میں رہے ہیں کہ ان کے توسط سے آپ کی پہنچ ڈاکٹر ڈریڈ تک ہو جائے۔“

”تمہارا یہ جملہ قطعی غیر ضروری ہے۔“

”زبان کاٹ کر پھینک دیجئے میری۔ میں آپ کی طرح فلسفی نہیں ہوں۔ بعض اوقات میری زبان میں کھلی ہوتی ہے اور میں بولنا چاہتا ہوں۔ خیالات خواہ ملے ہوں خواہ بھاری۔“

”مگر تم سنگرام کی بات کر رہے تھے۔“

”سنگرام انہیں پانچ آدمیوں کے ساتھ اسی جزیرے میں رہتا ہے۔“

”ارے تو پھر ہم یہاں کیا کر رہے ہیں۔ شراب کی بوتلیں مجھے پاگل کر دیتی ہے۔“

”بیٹھے رہو۔ چپ چاپ۔“

”اُسی صورت میں جب گلاس ہاتھ میں ہو۔ ٹھنڈے پانی کی کاسی۔“

فریدی خاموش رہا لیکن حمید کو الجھن ہونے لگی۔ یہاں کسی میز پر بھی اُس کی دلچسپی کا کوئی سامان نظر نہیں آ رہا تھا۔ چاروں طرف مردہی مردتھے۔

وہ بیٹھا بور ہوتا رہا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد ذہنی کسل دور ہو گیا کیونکہ اُس نے بار میں آرتھر کو داخل

کامیاب ہو گیا۔ یہاں سے قریب قریب پورا جزیرہ دکھائی دیتا تھا۔ لیکن وہ دروازہ یہاں سے نہیں نظر آتا تھی جس کے کنارے فریدی کچھ دیر لیٹا رہا تھا۔

اس نے سگار کا کونا توڑتے ہوئے ایک طویل سانس لی اور سگار ہونٹوں میں دبالی۔ لیکن وہ ٹار دیا تین منٹ تک یونہی ہونٹوں میں دبا رہا۔ فریدی کی آنکھوں سے گہرا نظر مترشح تھا۔ پھر غالباً اس نے سگار جلانے کا ارادہ ہی ترک کر دیا کیونکہ اب وہ پھر اُس کی جیب میں واپس چلا گیا تھا۔

ٹیلے پر خود رو پھولوں کی اونچی اونچی جھاڑیاں تھیں اور یہ اتنی گھنی تھیں کہ درجنوں آدمی دیکھ لے جانے کے خوف سے بے نیاز ان میں نہایت آسانی سے چھپ سکتے تھے۔

فریدی پھر کے ایک بڑے ٹکڑے پر بیٹھ گیا۔ سورج آہستہ آہستہ مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ اور پرندوں کے شور سے سارا جزیرہ گونج اٹھا تھا۔

اُس نے کلائی کی گھڑی کی طرف دیکھا اور پھر ٹیلے سے اُترنے لگا۔ اُسے توقع تھی کہ اب جزیرے میں پہنچ گیا ہو گا کیونکہ اُس نے اُسے ڈیڑھ گھنٹے قبل فون کیا تھا۔ ٹیلے سے اُتر کر وہ آبادی کی طرف چلے لگا۔

پھر کارواں بار کے سامنے ہی حمید سے ملاقات ہو گئی۔ اُس نے اُسے یہیں آنی کی ہدایت کی تھی۔

”تمہارے.... اس آرتھر نے بہت چکر دیئے۔“ اُس نے پھکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”کیوں....!“

”وہ بلاشبہ سنگرام ہی ہے۔ جیمسن اینڈ بارٹلے کے آفس سے وہ ڈھائی بجے ہی اٹھ گیا تھا۔ وہ دراصل یہیں اس جزیرے میں رہتا ہے۔“

”لیکن چکر کیسے دیا اُس نے۔“

”ابھی بتاتا ہوں۔ آدھیرے ساتھ۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بار میں لیتا چلا گیا۔

فریدی نے ایک کم آباد گوشہ منتخب کیا اور وہ بیٹھ گئے۔ یہاں اب ایک ہی آدھ میز خالی نظر آ رہی تھی۔

”بار میں بیٹھے سے کیا فائدہ۔“ حمید بڑبڑایا۔ ”خواہ خواہ آپ نے ایک میز گھیر لی ہے۔“

”بار والے کو اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔“

”اس کا نقصان تو ہو سکتا ہے۔“

ہوتے دیکھا تھا۔ اُس کے ساتھ دو آدمی اور بھی تھے۔

فریدی نے جھک کر سگارسنگاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ”ان کی طرف مت دیکھو۔“

”شکریہ... آپ نے مجھے دیکھنے کی زحمت سے بھی بچالیا۔ مرد مجھ سے نہیں دیکھے جاتے خواہ کسی خوبصورت لڑکی کے باپ ہی کیوں نہ ہوں۔“

”تم کس قسم کی لڑکی سے شادی کرنا پسند کرو گے۔“ فریدی نے غیر متوقع طور پر سوال کیا۔

”ایسی جو چھ ماہ بعد ہی طلاق کا مطالبہ کرنے لگے۔“ حمید نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ ہم بولا۔ ”آخر آج آپ میری شادی کے مسئلے میں کیوں دلچسپی لے رہے ہیں۔“

”تا کہ تم کچھ نہ کچھ کہتے رہو۔“

”یہ آرتھر اُس وقت بھی سیاہ عینک لگائے ہوئے ہے لیکن یہ ہمیں پہچانتا ہی ہوگا۔“

”اچھی طرح۔“

”پھر یہاں کھلے عام ہمارے بیٹھنے کا کیا مقصد ہے۔“

”بس بیٹھے رہو۔“

”نہیں میں تو لیٹوں گا۔“ حمید جھلا گیا۔

لیکن اتنے میں اُس نے فریدی ہی کو اٹھتے دیکھا۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف جا رہا تھا۔

لیکن چونکہ حمید سے کچھ نہیں کہا تھا اس لئے وہ بیٹھا ہی رہا۔ فریدی باہر جا چکا تھا۔

حمید نے اُس میز کی طرف نظر اٹھائی جہاں آرتھر اور اُس کے دونوں ساتھی بیٹھے تھے لیکن اب

وہاں تین کے بجائے چار آدمی نظر آ رہے تھے اور میز پر دوسکی کی دو بوتلیں بھی تھیں۔ سرو کرنے والے

ویٹروں کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ چاروں مستقل کاہلوں میں سے ہیں۔

تمباکو کے دھوئیں اور شراب کی ملی جلی بو حمید کو اپنے پر اکسار ہی تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ اب وہ تہہ

کر چکا تھا کہ کبھی شراب نہ پئے گا۔

بیس منٹ گذر گئے لیکن فریدی واپس نہیں آیا۔

حمید سوچ رہا تھا کہ آخر اس حرکت کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ کیا وہ یہ چاہتا تھا کہ وہ اکتاہٹ کا شکار

ہو کر کوئی ایسا اقدام کر بیٹھے جس کا رد عمل یقینی طور پر فریدی کیلئے سودمند ثابت ہو۔ اُسے ایسے ہی پچھلے کئی

مواقع یاد تھے جب فریدی نے اُسے تذبذب میں ڈال دیا تھا اور اسی تذبذب کے عالم میں حمید سے

جانتیں سرزد ہو گئی تھیں لیکن اُن حماقتوں سے فریدی نے اس طرح فائدہ اٹھایا تھا جیسے اُسے حمید سے اس کی توقع رہی ہو۔

وہ سوچنے لگا اگر وہ کچھ کئے بغیر ہی یہاں سے اٹھ کر گھر کی راہ لے تو کیا ہو۔ لیکن اس نے تہیہ

کر لیا کہ وہ نہ تو کوئی حرکت کرے گا اور نہ یہاں سے اٹھے گا۔ خواہ آرتھر اور اُس کے ساتھی اٹھ ہی کیوں

نہ جائیں۔

یہاں کا ماحول تھکا دینے والا تھا۔ اُسے حیرت تھی کہ آخر یہاں عورتیں کیوں نہیں دکھائی دیتیں

جب کہ جزیرے کے دوسرے کینے اور بار اُن سے ہر وقت بھرے رہتے ہیں۔

آرتھر اور اُس کے ساتھی بے تحاشہ بی رہے تھے اور اُن میں سے کوئی بھی حمید کی طرف متوجہ نہیں

معلوم ہوتا تھا۔

حمید نے پائپ سلگایا اور کرسی کی پشت سے ٹک کر ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔ اُسے اس پر بھی حیرت

تھی کہ ابھی تک کسی دیر نے اس کی طرف رخ بھی نہیں کیا تھا۔

دفعۃً وہ چونک پڑا۔ ایک آدمی نشے میں بہک رہا تھا۔ ”روڈل... روڈل... ڈوڈل... ڈوڈل... ہی... آ“

ایک تیز قسم کی کھر کھر اہٹ سے ہال گونجنے لگا اور کاؤنٹر کے اوپر دیوار کے ایک بورڈ کے حروف

روشن ہو گئے۔ ”براہ کرم انسانیت کی حدود سے نہ گذریئے۔“

مگر شائد ”روڈل ڈوڈل“ کرنے والا اپنی کسی مجبوری سے جھگڑا کر کے آیا تھا اُس پر اس روشن تحریر کا

کوئی اثر نہ ہوا۔ اور وہ ہوا میں مکالمہ کر چکا۔ ”انسانیت کی حدود ہیں ختم ہو گئی تھی جہاں اُسے سولی پر

چڑھایا گیا تھا۔“

اس پیغمبرانہ جملے پر حمید کا دل چاہا کہ میسر کے کسی بیرل میں چھلانگ لگا دے۔ مگر اب وہ بہکا ہوا

شرابی کہہ رہا تھا۔ ”ذور تھی... عورت نہیں کتیا ہے... ہا... کتیا کا بھی آفاقی ادب میں ایک مقام ہے۔“

ادب میں آفاقیّت نہ ہو تو کتیا... زندہ باد...!“

اس ”زندہ باد“ پر دو چار ”زندہ بادیں“ اور بلند ہوئیں... پھر ذرا ہی سی دیر میں مچھلی بازار بن گیا۔

اسی دوران میں حمید نے آرتھر اور اُس کے ساتھیوں کو اٹھتے دیکھا اور غیر ارادی طور پر وہ بھی اٹھ

گیا۔ پھر خیال آیا کہ کچھ دیر پہلے اُس نے اس کے برعکس کچھ سوچا تھا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ اب تو

اٹھ ہی چکا تھا۔

بھنڈی ہوائے شائد نشہ اور زیادہ گہرا کر دیا تھا۔

عمر پھر حمید نے سوچا کہ اُس سے کہا کس نے تھا کہ وہ آر تھر کا تعاقب شروع کر دے۔

دفعتاً اُس کی نظر بڑے نیلے کی طرف اٹھ گئی اور اُسے جھپٹ کر دوسرے تودے کی اوٹ لیتی پڑی

یونکہ نیلے پر ایک متحرک سایہ نظر آ رہا تھا۔ وہ اُسے دیکھتا رہا۔ کوئی اوپر سے نیچے آ رہا تھا۔

نیچے پہنچ کر وہ رکا۔ چند لمحے کھڑا رہا۔ پھر ایک طرف چلنے لگا۔ حمید نے اپنے مخصوص انداز میں سیٹی

بجائی اور سایہ رک گیا۔ اب حمید کو اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ اندھیرے میں کسی آدمی کے چلنے کا اندازہ

آفریدی کا سا معلوم ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ حقیقتاً فریدی ہی ہوگا۔ اُس نے سائے کو ایک

تودے کی اوٹ میں ہوتے دیکھا۔

حمید نے بھی اپنی پوزیشن تبدیل کی.... اور اب وہ کھسکتا ہوا اُس پتھر کی طرف بڑھنے لگا جس پر

آر تھر لیٹا ہوا تھا لیکن قبل اس کے کہ وہ اس تک پہنچ سکتا، سوئے ہوئے آر تھر کے چہرے پر روشنی کی ایک

تپکی سی لکیر پڑی۔ سامنے والے تودے کے پیچھے کوئی موجود تھا۔ حمید جہاں تھا وہیں رہا۔ نہ تو اُس نے

اُس تودے کی طرف بڑھنے کی کوشش کی جدھر سے روشنی آ رہی تھی اور نہ آر تھر کی طرف۔

روشنی آتی بند ہوگئی۔ آر تھر شائد بے خبر سو رہا تھا۔ آخر حمید اس آنکھ بھولی سے تنگ آ گیا۔ وہ سوچ

رہا تھا کہ اب کچھ نہ کچھ ہو ہی جانا چاہئے ورنہ رات یونی ختم ہو جائے گی۔

اُس نے جیب سے ریو اور نکال کر کہا۔ ”اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ.... پولیس۔“

”ہائیں.... پپ.... پپ.... پولیس....!“ آر تھر اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر ہٹکایا اور پتھر سے نیچے

لڑھک گیا۔ دوسرے ہی لمحے میں ایک لمبی کراہ کے ساتھ اُس کے حلق سے گندی سی گالی نکلی۔

تودے کے پیچھے جو کوئی بھی تھا اب سامنے آ گیا۔

”اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔“ حمید کڑک کر بولا۔

”اور اگر میں انکار کر دوں تو۔“ بہت ہی سرد لہجے میں جواب ملا اور حمید کی جان میں جان آئی۔ یہ

فریدی ہی تھا۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو۔“ اُس نے ناخوشگوار لہجے میں پوچھا۔

”یہی سوال میں آپ سے بھی کر سکتا ہوں۔“

”بکومت۔ میں نے تم سے کب کہا تھا کہ تم اُن میں سے کسی کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک

چاروں شائد بہت زیادہ پی گئے تھے۔ ان کی رفتار میں لغزش تھی۔ حمید اُن کے پیچھے چلا رہا

اندھیرا بھیل چکا تھا اور سمندر کی بوجھل ہوائے جھونکے اُسکے چہرے سے ٹکرا رہے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے

دقت سے وہ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتا اور اُسے ہوا میں ملے ہوئے نمک کی شوریت محسوس ہوتی۔

وہ چلتے رہے.... گھاٹ کے قریب پہنچ کر حمید نے محسوس کیا کہ وہ دوستانہ انداز میں گفتگو کر

کر رہے ہیں۔ اُن کی آوازیں آہستہ آہستہ بلند ہوتی جا رہی تھیں۔ اچانک اُن میں سے ایک نے

دوسرے پر ہاتھ چھوڑ دیا اور پھر تین آدمی بیک وقت ایک آدمی پر ٹوٹ پڑے۔

حمید جہاں تھا وہیں رک گیا۔ گھاٹ ویران نہیں تھا۔ چاروں طرف سے لوگ دوڑ پڑے اور انہیں

الگ کر دیا گیا۔

حمید اُن میں دلچسپی لینے کی بجائے مجمع کو گھور رہا تھا اور اُسے فریدی کی تلاش تھی۔ وہ الجھن میں

بتلا ہو گیا تھا۔ آخر فریدی کہاں گیا۔ اتنی دیر تک بار میں بیٹھنے کا کیا مقصد تھا۔ پھر اُسے کوئی ہدایت دیے

بغیر اس طرح اٹھ جانا۔

اچانک اُس نے آر تھر یا سنگرام کو مجمع سے الگ ہوتے دیکھا۔ یہاں کافی روشنی تھی اور حمید ہر ایک

کو بے آسانی دیکھ سکتا تھا۔ آر تھر شائد وہاں سے کھسک جانے کی فکر میں تھا۔

حمید نے بھی ادھر ہی قدم اٹھائے جدھر آر تھر کا رخ تھا لیکن وہ جزیرے کے ایک ویران حصے کی

طرف جا رہا تھا۔ حمید چلتا رہا۔ آخر وہ بڑے نیلے کے قریب پہنچ کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ یہاں بے شمار

اونچے اونچے تودے بکھرے ہوئے تھے اور حمید اس سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ تاروں کی چھاؤں میں

وہ اُسے صاف دیکھ رہا تھا۔

لیکن اب سوال یہ تھا کہ وہ کسی خاص مقصد کے تحت ادھر آیا ہے۔ اُس بھیر سے پیچھا چھڑانے

کے لئے اُس نے ادھر کا رخ کیا تھا۔ آر تھر یا سنگرام پولیس سے دور ہی رہنے کی کوشش کرتا کیونکہ اُس کا

پچھلا ریکارڈ اچھا نہیں تھا۔ لہذا ممکن ہے اس جھگڑے میں پولیس کی مداخلت کے خوف سے وہ ادھر چلا

آیا ہو۔

کچھ بھی ہو اُسے فریدی پر تاؤ آ رہا تھا اور یہ بھی کوئی نئی بات نہیں تھی اُسے دن میں متعدد بار فریدی

پر تاؤ آتا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے آر تھر پتھر پر لیٹ گیا اور حمید کا دل چاہا کہ اپنا سر پیٹ ڈالے۔ آر تھر تو نشے میں

چلے آؤ۔ مگر اسے کیا ہوا۔“

”وہی جو زیادہ شراب پینے کے بعد ہوتا ہے۔“ حمید نے بے دلی سے جواب دیا۔ اُس کا موڈ بڑا سوچ کر بہت زیادہ خراب ہو گیا کہ وہ فریدی کی دانست میں اتنی دیر سے جھک ہی مارتا رہا تھا۔

## پھر پیو

آرتھر کو ہوش آنے پر محسوس ہوا کہ وہ کسی کمرے میں ہے۔ حالانکہ وہ فن آئی لینڈ کی ایک چٹان پر لیٹ کر سو گیا تھا۔ اُس نے پلنگ سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھنا چاہا لیکن دوسرے ہی لمحے میں دروازہ کھلا اور دروازے میں جو آدمی بھی اُسے نظر آیا وہ کم از کم اُس کے لئے کسی اچھے مستقبل کا پیغامبر نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اُسے اچھی طرح پہچانتا تھا۔ نہ صرف پہچانتا تھا بلکہ ہمیشہ اُس سے دور ہی دور رہنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ یہ کرل فریدی تھا۔

”کیوں سنگرام۔۔۔ کیا اب تم پوری طرح ہوش میں ہو۔“ اُس نے پوچھا۔

”آپ میرے خلاف کچھ ثابت نہیں کر سکیں گے۔“ سنگرام نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”اُوہو۔۔۔ بڑی مصیبت ہے۔“ فریدی مسکرایا۔ ”کیا میں ہر ایک کے پیچھے اس لئے پھرا کرتا ہوں کہ اُس کے خلاف کچھ نہ کچھ ثابت ہی کر ڈالوں۔“

سنگرام کچھ نہ بولا۔ اُس کی نظر فریدی کے چہرے پر تھی لیکن فریدی کے چہرے پر اُسے بڑے آثار نہیں دکھائی دیئے۔ وہ بہت ہی دوستانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔

”تم وہاں بہت بُری حالت میں پڑے ہوئے تھے۔“ فریدی نے کہا۔ ”تمہیں سانپ ہی ڈس لیتا تو۔۔۔ میں تمہیں یہاں اٹھا لیا۔ اب تم کہہ رہے ہو کہ میں تمہارے خلاف کچھ ثابت کر دوں۔ ہاں اگر اس سے تمہارا کوئی مرض دور ہو سکے تو میں یہ بھی کر گذروں گا۔“

”میں سمجھتا ہوں۔ بلکہ مجھے یقین ہے کہ آپ سعیدہ رحمان والے سلسلے میں مجھے پرشبہ کر رہے ہیں۔“

”تم بڑے اچھے طالب علم ہو سنگرام۔ بیٹھ جاؤ۔ سوال کرنے سے پہلے ہی جواب تیار رکھتے ہو۔“

فریدی ایک آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔

آرتھر بیٹھا ہوا بولا۔ ”آپ میرے خلاف کچھ نہیں ثابت کر سکتے۔ میرا پورا نام آرتھر سنگرام ہے۔“

”اور مونچھیں تمہاری اپنی ملکیت ہیں۔“ فریدی مسکرایا۔

”تفصی۔۔۔ مجھے پورا پورا حق حاصل ہے جب چاہوں رکھوں جب چاہوں صاف کرادوں۔“

”سنگرام تم بوکھلاہٹ میں بچوں کی سی اور مٹھکے خیز گفتگو کر رہے ہو۔ اپنے حواس کو یکجا کرو۔

نہارے خلاف میں کچھ نہیں ثابت کر سکتا۔“

”تو پھر اس کا مطلب۔۔۔ سنگرام چاروں طرف دیکھتا ہوا بولا۔

اتنے میں ایک ملازم ہاتھوں پر ایک کشتی اٹھائے اندر داخل ہوا۔ کشتی میز پر رکھ دی گئی۔ اس میں

ایک ساخن۔۔۔ ایک گلاس اور اسکاچ کی بوتل تھی۔

ملازم باہر جا چکا تھا۔

”اپنی مدد آپ کرو۔“ فریدی نے کشتی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”حواس کو یکجا کرنے کے لئے

منید ثابت ہوگی۔“

”آفر مقصد کیا ہے۔“

”اُوہ۔۔۔ سنگرام۔۔۔ اچھی بات ہے۔ تم پھر اتنی ہی پیو۔ اتنے ہی مد ہوش ہو جاؤ اور پھر میں تمہیں

جزیرے کی اُسی چٹان پر پھکوا دوں۔“

سنگرام کچھ نہ بولا۔ لیکن وہ پلنگ ہی پر بیٹھا رہا۔

”کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ شراب زہریلی ہے۔“

”نہیں۔۔۔!“

”پھر۔۔۔ تم پیتے کیوں نہیں۔“

”کرل فریدی کا کوئی اقدام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔“

”ٹھیک ہے۔ تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔“

”آپ مجھے اس کا مقصد بتا دیجئے۔“

”کیا واقعی تم اُس چٹان پر خودکشی ہی کی نیت سے لیٹے تھے۔“

”نہیں میں نشے میں تھا۔“

”چلو۔۔۔ اسی لئے تو کہہ رہا ہوں کہ کچھ اور پیو مگر اتنی نہیں کہ پھر ویسے ہی ہو جاؤ۔“

”اچھا پھر اس کے بعد آپ کیا کریں گے۔“

”تمہیں رخصت کر دوں گا۔“

یہی نے اُسے غور سے دیکھا اور پھر بیٹھ گیا۔ لیکن وہ بڑے بے تعلقاتانہ انداز میں سگار سلگا رہا تھا۔  
”آپ کل صبح میرے خلاف کیا ثابت کریں گے۔“ سنگرام نے پوچھا۔

”اوہو... تم ابھی تک اسی الجھن میں ہو۔ بیٹھو بیٹھو یہ تو میں نے یونہی کہہ دیا تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ اگر تم جیسا کوئی آدمی ہر وقت محتاط نہ رہے تو بڑی آسانی سے اس کی گردن پھنس سکتی ہے۔“

”خدا را ہم قسم کی گفتگو نہ کیجئے۔“

”سنگرام! کیا یہ گفتگو تمہارے لئے مبہم ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ تم ایسا کہہ رہے ہو۔ کیا تم آج کل فریڈیٹا نہیں ہو۔“

سنگرام دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے مختلف قسم کے خیالات نے اس کے ذہن میں پراگندگی پیدا کر دی ہو۔

”کیا تم آج کل جس راستے پر چل رہے ہو ہمیشہ اُسی پر چلتے رہے ہو۔ آدمی کو اپنی لائن سے نہ ہٹنا چاہئے۔ یہ راستہ بلیک میلنگ سے زیادہ خطرناک ہے۔ تم تمہارے قانون کی گرفت سے بچے رہ سکتے ہو کیونکہ تم نے شروع سے اس کی مشق بہم پہنچائی ہے لیکن اس نئے راستے کے اناڑی مسافر۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تم اب اندھیرے میں نہیں رہے۔ کم از کم میرے لئے روشنی میں آچکے ہو۔“

سنگرام کی ٹھوڑی دونوں ہاتھوں پر لگی ہوئی تھی اور وہ کسی خوفزدہ بچے کی طرح فریڈی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

فریڈی کہتا رہا۔ ”ان میں سے کون ہے جو میری نظر میں نہ ہو۔ صفدر، سعید، ماتھر، مورلی، رام سنگھ اور کتنے نام گنواؤں۔ میں ان سبھوں کو جس وقت چاہوں گرفت میں لے سکتا ہوں۔“

”م... مجھے بھی... کہنے دیجئے۔“ سنگرام بھراہکی ہوئی آواز میں بولا۔

”کہو! میں نے تمہیں روکا تو نہیں۔“ فریڈی نے لا پرواہی سے کہا۔

”میں نادانستہ طور پر ان لوگوں کے چکر میں پھنس گیا ہوں۔ اور اب میری گردن اچھی طرح پھنسنے لگی ہے۔ ڈاکٹر ڈریڈ مجھ سے بھی بڑا بلیک میلر ہے۔ اسکے پاس میرے خلاف واضح ترین ثبوت ہیں۔“

”تو اس نے تمہیں بلیک میل کیا ہے۔“

”جی ہاں... میں اُس کے احکامات کی تعمیل پر مجبور ہوں۔“

”تم کب سے اُس کے لئے کام کر رہے ہو۔“

”میں کیسے یقین کر لوں۔“ سنگرام نے کہا۔ مگر اب وہ میز کے قریب آ کر سائیفن سے سوڈا لے رہا تھا۔ خالی سوڈے کا ایک گلاس چڑھالینے کے بعد اس نے کہا۔ ”میرے حواس یکجا نہیں ہو سکتے۔“

”ٹھوڑی اسکاچ بھی لو۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنی حالت بہتر محسوس کرو گے۔“

”شکریہ۔“ سنگرام نے تین انگلی اسکاچ ناپ کر لی اور اس میں سوڈا ملانے لگا۔ تقریباً پانچ منٹ تک کمرے پر بوجھل سکوت طاری رہا۔ سنگرام گلاس خالی کر کے ٹرے میں رکھ چکا تھا۔

فریڈی نے ایک بار اس کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولا۔ ”کیوں... کیا... اب بھی تم بہتر نہیں محسوس کر رہے ہو۔“

”میں اب ٹھیک ہوں۔“

”لیکن زیادہ دنوں تک ٹھیک نہ رہ سکو گے۔ ابھی تک پولیس تمہارے خلاف کچھ نہیں ثابت کر سکی لیکن اب یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ حالات کیا ہوں۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

”کچھ نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ اگر اب تم جانا چاہتے ہو تو جاؤ۔“

سنگرام کے چہرے پر ذہنی الجھن کے آثار نظر آنے لگے۔

”کیا آپ!...“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”کہو!...“

”کچھ نہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہوں۔“

”مت کہو۔ یہ رعایت صرف رات بھر کے لئے ہے۔ آج کی رات میرے پاس تمہارے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے لیکن کل صبح کے لئے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

”میں پھر نہیں سمجھا۔ صاف صاف کہئے۔“

”کچھ نہیں بھئی۔ اب مجھے نیند آرہی ہے۔“ فریڈی اٹھتا ہوا بولا۔ ”اگر اس وقت نہ جانا چاہو تو یہیں آرام کرنا۔“

”میں رات بھر میں پاگل ہو جاؤں گا۔“

”مگر پاگل ہونے سے پہلے مجھے یہ ضرور بتا دینا کہ تمہیں کہاں کے پاگل خانے میں رکھا جائے۔“

سنگرام نے کچھ کہنا چاہا مگر پھر ہونٹ بند کر لئے۔ سچ اُنکی آنکھوں سے دیوانگی جھانکنے لگی تھی۔

”چار ماہ سے۔“

”جیسے اینڈ بارٹلے کے یہاں کب سے ملازم ہو۔“

”ایک سال سے۔“

”سعیدہ سے دوستی کتنی پرانی ہے۔“

”ظاہر ہے کہ ہم دونوں ایک ہی فرم میں کام کرتے تھے اس لئے وہاں جتنا پرانا میں ہوں اتنی ہی پرانی دوستی بھی ہو سکتی ہے۔“

”اس کے اغواء کا تمہیں علم ہے۔“

”نہیں!۔“

”پھر تم ڈاکٹر ڈریڈ کے لئے کیا کام کرتے رہے ہو۔“

”مختلف قسم کے کام۔ لیکن میں نے ابھی تک کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے.....!۔“

”ارے چھوڑو..... گردن پھسانے کیلئے اتنا ہی کافی ہے کہ تم ڈاکٹر ڈریڈ کیلئے کام کرتے رہے ہو۔“

”میں یہ کب کہتا ہوں کہ آپ مجھے جہنم میں نہیں پہنچا سکتے۔ لیکن اگر سعیدہ کا اغواء ڈریڈ ہی کی ذات سے تعلق رکھتا ہے تو مجھے اس کا کوئی علم نہیں ہے۔“

”ڈریڈ کے لئے تم سے کون کام لیتا ہے۔“

”ماقر.....!۔“

”اُس نے تم سے سعیدہ کے متعلق کبھی کوئی گفتگو نہیں کی۔“

”گفتگو..... ٹھہریے۔“ سگرام نے کہا اور کچھ سوچنے لگا۔ پھر بولا۔ ”یوں تو ہم ہر وقت ہی اُس

کے متعلق کچھ نہ کچھ گفتگو کرتے رہتے تھے۔ میں دراصل آج کل ماقر ہی کے ساتھ رہتا ہوں۔“

”مجھے علم ہے..... ہاں تو وہ گفتگو کس قسم کی ہوتی تھی۔“

”ماقر کا خیال تھا کہ میں سعیدہ کو پھانس کر اُس سے شادی کر سکتا ہوں اور بھی ایسی ہی بہتری

باتیں جو سعیدہ سے تعلق رکھنے والا ہر آدمی سوچتا ہوگا کیونکہ وہ اچانک اتنی مالدار ہو گئی تھی..... اور غیر شادی شدہ تھی۔“

سگرام خاموش ہو گیا۔ فریدی اُسے اس انداز سے گھور رہا تھا جیسے اُس کی آنکھوں سے اُس کے بیان کی تصدیق کرنا چاہتا ہو..... اُس نے کچھ دیر بعد پوچھا۔ ”کیا تم بتا سکو گے کہ یہاں کے بڑے

آدمیوں میں سے کون کون اس میں دلچسپی لے رہا تھا۔“

”میں صرف دو یا تین کو جانتا ہوں لیکن ویسے میرا خیال ہے کہ شہر کے سارے بڑے آدمی اُس

میں دلچسپی لے رہے تھے۔ سرمایہ دار طبقہ کے ہر جوان آدمی کی خواہش تھی کہ کسی طرح وہ سعیدہ کو حاصل

کرنے میں کامیاب ہو جائے۔“

فریدی تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ ”کیا تم نے اُسے مشورہ دیا تھا کہ وہ ملاقاتیوں کے

کارڈ بہت احتیاط سے رکھا کرے۔“

”میرے خدا۔“ سگرام یک ایک اچھل پڑا۔ ”آپ کو کیسے معلوم ہوا۔ ہاں میں نے ہی اُسے یہ

مشورہ دیا تھا۔“

”اور تمہیں اس کا مشورہ ماقر نے دیا تھا..... کیوں؟“

”یہ بھی صحیح ہے۔“ سگرام نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔ اُسکی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

”اُس نے تمہیں یہ مشورہ کیوں دیا تھا؟“

”میری ہی لائن کی ایک اسکیم تھی۔“ سگرام طویل سانس لے کر بولا۔ ”اُس کا خیال تھا کہ میں

اُس کے امیر طلب گاروں کی فہرست مرتب کروں اور ان کے متعلق چھان بین کرتا رہوں۔ پھر جب

اُن سے کسی کی بات سعیدہ کے ساتھ کی ہو جائے تو میں اُسے بلیک میل کروں۔ سرمایہ داروں میں شائد

ہی کوئی ایسا ہو جس میں کمزوریاں نہ ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ اُس کا ہونے والا شوہر بھی کسی ایسے جرم کا

مرکب ثابت ہو جو اُسے سعیدہ کی نظروں سے گرا سکے۔ لہذا ایسی صورت میں بلیک میلنگ کے بہترین

مواقع ہاتھ آ سکتے ہیں..... ماقر کی یہ تجویز بڑی شاندار تھی لیکن آپ کو اس کا علم کیسے ہوا۔“

فریدی کچھ نہ بولا۔ سگرام اپنے سوال کے جواب کا منتظر تھا لیکن فریدی نے اُسے نظر انداز کر کے

پوچھا۔ ”تو تم نے فہرست مرتب کر لی ہے۔“

”جی ہاں.....!۔“

”کتنے آدمی ہوں گے۔“

”تمیں.....!۔“

”مگر ابھی تم نے کہا تھا کہ تم دو یا تین آدمیوں کے علاوہ اور کسی کو نہیں جانتے۔“

”جی ہاں..... یہ وہ تین آدمی ہیں جن کے متعلق میں چھان بین کرتا رہا ہوں۔“

”انہیں تین تک چھان بین کیوں محدود رکھی۔“

”کیونکہ انہیں سعیدہ پسند کرتی تھی۔“

”مجھے پوری فہرست چاہئے۔“ فریدی نے کہا۔

”دیکھئے! میرا بھی یہی خیال ہے کہ انہیں لوگوں میں سے کسی کا ہاتھ اس اغواء میں ہے۔“

”ہاتھ تو تمہارا بھی ہو سکتا ہے سنگرام۔ تم اُسے اغواء کر کے کسی بڑے گاہک کے ہاتھ فروخت کر سکتے ہو کسی بہت بڑی قیمت پر۔“

”اگر آپ مجھ پر شبہ ہی کر رہے ہیں تو میں آپ کو ایک مشورہ دوں گا۔“

”کیا...؟“

”مجھے گرفتار کر کے اُس وقت تک بند رکھئے جب تک کہ سعیدہ کا سراغ نہ مل جائے۔“

”تم مجھ سے بھاگ کر جاؤ گے کہاں۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”البتہ دوسری دنیا تک میری پہنچ نہ ہو سکے گی۔“

”پھر آپ کا شبہ رفع کرنے کی دوسری صورت کیا ہو سکتی ہے۔“

”اس کی فکر نہ کرو۔ مجھے اُن لوگوں کی فہرست چاہئے لیکن تم اس کا تذکرہ مقرر سے نہیں کرو گے۔“

”میں وہی کروں گا جو آپ فرمائیں گے۔ فہرست کل شام تک آپ کو مل جائے گی... لیکن

فی الحال ڈریڈ سے روگردانی بھی میرے لئے مشکل ہوگی۔“

”میں کب کہتا ہوں کہ تم اُسے چھوڑ دو۔“

”مگر مجھے حیرت ہے جناب کہ آپ نے ڈریڈ کے متعلق کچھ نہیں پوچھا۔“

”تم اس کے متعلق جانتے ہی کیا ہو گے۔ تمہارے فرشتوں کو بھی علم نہ ہوگا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔“

”اچھا اب تم جاسکتے ہو۔“

”کمرے پر بوجھل سا سکوت طاری ہو گیا۔“



حمید بہت دیر سے اُچھل کود رہا تھا۔ آخر فریدی کو کہنا ہی پڑا۔ ”پوچھو۔ کیا پوچھنا چاہتے ہو۔!“

”پرویز اور قاسم کو لانے کی کوشش کیوں کی تھی۔“

”حقیقت معلوم کرنے کے لئے۔“

”کیسی حقیقت۔!“

”یہی کہ ان دونوں کا تعلق اس اغواء سے ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اگر یہ حرکت خود پرویز ہی کی ہوتی تو

وہی اس طرح چڑھ کر عاصم پر نہ جاتا اور اگر حقیقتاً عاصم کا ہاتھ اس میں ہوتا تو وہ راکفل لے کر پرویز پر

ندوڑتا۔ چور کا دل ہی کتنا۔“

”مگر پرویز نشے میں تھا۔“

”اتنا زیادہ بھی نہیں کہ بڑے بھلے کی تمیز نہ رہ جاتی۔“

”مگر اُس نے اپنے بیان میں یہ نہیں لکھوایا کہ اس کا مشورہ کرنل فریدی نے دیا تھا۔“

”وہ احمق نہیں ہے۔ اتنا سمجھتا ہے کہ اس بیان پر کوئی یقین نہیں کرے گا۔ بالکل اُسی طرح جیسے

خود اس کی کہانی پر تمہیں یقین نہیں آیا۔“

”آپ کو آگیا ہے۔“

”ہاں مجھے یقین ہے کسی نے اُسے آلہ کار بنانے کی کوشش کی ہے۔“

”مگر کس طرح۔ ارے اس کا کیا مقصد ہو سکتا ہے کہ اُسے اس کے گھر سے پکڑ لے گئے۔ اُس کی

خاطر مدارت کی۔ دولتیاں اس کی مرمت بھی کرتی رہیں اور سر بھی سہلاتی رہیں۔ یہ پرویز کا پٹھا مجھے

افنی معلوم ہوتا ہے۔“

”سب کچھ جلد ہی روشنی میں آجائے گا گھبراتے کیوں ہو۔“

”اچھا!... پچھلی رات آپ مجھے بار میں چھوڑ کر اُس نیلے پر کیوں جا چڑھے تھے۔ کیا مرخ میں

پہنچنے کا ارادہ تھا۔“

”پچھلی رات بھی ڈریڈ ہی کا چکر تھا۔ مجھے باہر سے اشارہ ملا تھا کہ ایک تیز رفتار سفید کشتی

جزیرے کے گرد چکر لگا رہی ہے۔ بہر حال مجھے اتنی جلدی میں اٹھنا پڑا تھا کہ تم سے کچھ نہ کہہ سکا۔“

”پھر اُس کشتی کا کیا ہوا۔“

”وہ شاید اطلاع دینے والے کا واہمہ تھا۔ کشتی دراصل بحری فوج کی تھی۔ کچھ بھی ہو پچھلی رات

کچھ نہ کچھ کام تو ہوا ہی تھا۔ سنگرام کے متعلق پہلے سے کوئی پروگرام نہیں بنایا گیا تھا لیکن اُس سے گفتگو

کرنے کے بعد ہی میں اس نتیجے پر پہنچ سکا کہ اس معاملے میں وہ کتنا اہم رول ادا کر رہا ہے۔ وہ

”ڈیننگ کارڈ میرے ذہن میں بُری طرح کھٹک رہے ہیں جو ایک نامعلوم آدمی سعیدہ کے گھر سے



اڑا لے گیا تھا۔ وہ اتنے ہی اہم تھے حمید صاحب کہ اُس آدمی کو ایک پولیس انسپکٹر بن کر آنا پڑا تھا۔  
 ”ارے تو ان کی فہرست آپ کو مل ہی جائے گی۔“  
 ”لیکن اس کے باوجود بھی شاید حقیقت تک پہنچنے میں دشواری ہو۔“

## دوسری پلیٹ

سنگرام چار بجے اپنے آفس سے نکلا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا ریکسٹن اسٹریٹ پر مڑ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جلدی میں اُسے کہیں پہنچنا ہے۔ کچھ دور چلنے کے بعد وہ پھر ایک پتلی سی گلی میں مڑا۔ اس کے دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں تھے۔ لیکن اب اس کی رفتار سست ہو گئی تھی۔

یہاں دونوں طرف اونچی اونچی دیواریں تھیں اور ان میں چھوٹے بڑے نئے پرانے نقش اور بدوض دروازے نصب تھے۔ سنگرام ایک دروازے پر رک گیا۔ وہ مقفل تھا اُس نے قفل کھولا اور دروازے کو دھکا دے کر اندر داخل ہوا۔ سامنے ہی تنگ قسم کے زینے تھے جن کا سلسلہ اوپر کی طرف چلا گیا تھا۔ وہ دروازہ بند کر کے زینے طے کرنے لگا۔

زینے اُسے ایک کمرے میں لے گئے جہاں کے سامان سے کمرے کے مالک کی شکستہ حالی ظاہر تھی۔ ایک طرف ایک جھولدار پلنگ موجود تھا اور دیوار سے لگا ہوا ایک شلف رکھا تھا جس میں دو تین کتابوں کے علاوہ شیونگ کا سامان چائے کی چھوٹی پیالیاں سگرٹوں کے خالی پیکٹ اور دوسری چیزیں بھری ہوئی تھیں۔

ایک طرف ٹین کا ایک پرانا صندوق پڑا ہوا تھا اور گرد کی تہیں کہہ رہی تھیں کہ کمرے کو بہت دنوں سے استعمال نہیں کیا گیا۔

وہ ابھی بیٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ کسی نے نیچے سے دروازے پر دستک دی۔ سنگرام سناٹے میں آ گیا کیونکہ شاید اس مکان میں اُس کے لئے پہلا موقع تھا جب اُس نے کوئی دستک سنی تھی۔ شاید اُس کا مستقل قیام یہاں نہیں رہتا تھا۔

دستک برابر جاری رہی۔ کوئی دروازہ پیٹ رہا تھا۔ اُسے اس طرح ہلارہا تھا جیسے توڑ ہی ڈالے گا۔ سنگرام کو غصہ آ گیا۔ وہ دانت پیٹتا ہوا نیچے پہنچا اور ایک جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھول دیا۔ سامنے ایک شکستہ حال آدمی کھڑا تھا جس کی ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی اور گرم کوٹ چیتھڑوں کی شکل میں اُس کے جسم

پوش رہا تھا۔ دفعتاً اُس نے اپنے بائیں ہاتھ سے دائیں جیب کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا داہنا ہاتھ جیب میں تھا اور جیب سے ریوالور کی نال جھانک رہی تھی۔

سنگرام آنکھیں پھاڑے اُسے گھور رہا تھا۔ یہ ایک متوسط قد کا آدمی تھا اور اُس کے چہرے پر بڑھی اس طرح بکھری ہوئی تھی جیسے کسی ویران زمین پر جھاڑیاں اُگ آئی ہوں۔ بے ترتیب اور الجھی ہوئی اُس نے سنگرام کو اوپر چلنے کا اشارہ کیا۔

سنگرام کی نظر پھر جیب سے جھانکتی ہوئی نال پر پڑی اور وہ زینوں کی طرف مڑ گیا۔ پھر اُس نے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی لیکن دیکھنے کے لئے مڑا نہیں۔ اوپر پہنچ کر اُس نے اجنبی کی طرف مڑے بغیر کہا۔

”مقصد کیا ہے.... دوست....!“

لیکن اُسے جواب میں غیر متوقع طور پر غیر ملکی لہجے میں انگریزی سننی پڑی۔ اجنبی کہہ رہا تھا۔ ”ہم انگریزی ہی میں گفتگو کریں گے۔ تم انگریزی بول اور سمجھ سکتے ہو۔“

”ہاں.... چلو انگریزی ہی سہی۔ مگر اس کا مقصد۔“

”میں فنج ہوں۔“ اجنبی نے کہا۔

”جب تم بھوت ہو۔“ سنگرام نے ہنس کر کہا۔ ”ڈریڈ کے مرنے والے آدمیوں میں سے ایک۔ نہ تمہاری بہت زیادہ لمبائی کا تذکرہ کیا تھا۔ لیکن تم اس وقت متوسط قد کے ہو۔ لیکن عام حالات میں تمہارا قد ساڑھے چار فٹ سے زیادہ نہیں ہوتا۔“

”تم اس کی پرواہ مت کرو۔“ اجنبی نے کہا۔ ”اس صندوق کو کھول کر سفری ٹرانسمیٹر نکالو۔“

”کیا مطلب....!“ سنگرام اُسے گھورنے لگا۔

”تمہیں مطلب سے غرض نہ ہونی چاہئے۔ جو میں کہہ رہا ہوں کرو۔ ورنہ نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔“

”سنو! اگر تم واقعی فنج ہو تو مجھے اپنا چہرہ دکھاؤ۔ پھر میں ٹرانسمیٹر بھی نکال لوں گا۔“

”چہرہ.... اچھا دیکھو....!“ اجنبی نے اپنے بکھرے ہوئے بالوں میں انگلیاں دوڑائیں اور

”دوسرے ہی لمحے میں ڈاڑھی سر کے بالوں سمیت کسی پھل کے چھلکے کی طرح چہرے سے الگ ہو گئی۔

سنگرام ایک بار پھر سناٹے میں آ گیا۔ فنج کے چلنے کے متعلق اُس نے جو کچھ بھی سنا تھا اُس میں سرفراز نہیں تھا۔ وہی جبر پایا ہوا چھوٹا سا چہرہ۔ ننھی ننھی چمکدار آنکھیں اور بندروں کی سی پیشانی۔“

”لیکن فنج کا یہاں کیا کام۔“

”ہاہا!۔“ فنج نے قہقہہ لگایا۔ ”اگر یہاں کوئی کام نہیں ہے تو تم فنج میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہو۔“

سنگرام کچھ نہ بولا۔ وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہا تھا۔

”فضول ہے۔“ فنج نے کہا۔ ”صندوق کھولو۔“

سنگرام جھک کر صندوق کھولنے لگا۔ فنج کی چمکی آنکھیں اُس پر سے ایک لحظہ کے لئے بھی نہیں۔ سنگرام نے ٹرانسمیٹر نکال کر صندوق پر رکھ دیا۔

”ڈاکٹر ڈریڈ سے کہو کہ سعیدہ رحمان والا معاملہ فنج کو معلوم ہے اور وہ اس سلسلے میں اپنا بھلا بھی چاہتا ہے۔ ورنہ اس دور دراز ملک میں وہ بیچارہ اپنے جسم اور روح میں رابطہ کس طرح قائم رکھے گا۔“

”اوہ.... تو کیا یہ حقیقت ہے کہ ڈریڈ اس کا ذمہ دار ہے۔“

”چلو!۔“ فنج نے آگے بڑھ کر ریوالور کی نال اُس کی کیپٹی پر رکھ دی اور پھر بولا۔ ”اُس سے کہ دینا کہ تم ماتھر کے یہاں سے بول رہے ہو۔“

سنگرام نے ٹرانسمیٹر میں کہنا شروع کیا۔ ”ہلو.... ہلو.... ڈی ڈی پلیز.... سکس تھری اسپیکنگ!۔“

”ہلاؤ!۔“ ایک بھرائی ہوئی سی آواز آئی۔

”میری کیپٹی پر فنج کار ریوالور رکھا ہوا ہے۔ میں ماتھر کے یہاں سے بول رہا ہوں۔“

”ماتھر کہاں ہے۔“

”وہ اس وقت موجود نہیں ہے۔ فنج کہتا ہے کہ سعیدہ رحمان والے معاملے میں اس کا بھی بھلا ہونا چاہئے۔“

”وہ خود کیوں نہیں بولتا۔“

”ہٹ جاؤ۔“ فنج نے سنگرام کو ایک طرف دھکا دیا لیکن ریوالور کی نال بدستور اس کی کیپٹی سے لگی رہی۔

”فنج اسپیکنگ۔“

دوسری طرف کسی درندے کی سی غراہٹ سنائی دی۔ ”کیا بک رہے تھے تم۔“

”دنیا کا یہ حقیر ترین چیونٹا تمہیں تیسری بار آگاہ کرتا ہے کہ تمہاری موت اُسی کے ہاتھوں واقع ہوگی۔“

دوسری طرف سے ایک تضحیک آمیز سی ہنسی کی آواز آئی۔

”اور.... سعیدہ رحمان والے قے میں مجھے معقول حصہ ملنا چاہئے ورنہ میں سارا طلسم توڑ دوں گا۔“

”فنج!۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”ابھی تک میں تجھے صرف ایک سرکس کا مسخرہ سمجھ کر معاف کرتا رہا مگر اب!۔“

”میں زیادہ باتیں کرنے کا عادی نہیں ہوں۔“ فنج نے بندروں کی طرح دانت نکالے۔ ”اگر تم نے اس معاملے میں میرے حصے کا خیال نہ رکھا تو بھگتو گے۔ تمہارا ایک ایک آدمی میری نظروں میں ہے.... اور!۔“

فنج ٹرانسمیٹر کے پاس سے ہٹ آیا۔ دوسری طرف سے بھی کوئی آواز نہیں آئی۔

”اب کیا ارادہ ہے۔“ سنگرام نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر پوچھا۔

”کچھ نہیں.... اب تم آرام کرو۔“ فنج کے غیر متوقع طور پر اُسکے سر پر ریوالور کا کندہ رسید کر دیا۔

سنگرام نے لڑکھڑا کر سنبھلنا چاہا لیکن دوسرا ہاتھ پڑا اور وہ چکرا کر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ پہلے تو اُس کمرے میں کالے کالے گنجان دائرے سے چکراتے معلوم ہوئے اور پھر گہرا اندھیرا چھا گیا۔



کیپٹن حمید ہائی سرکل نائنٹ کلب میں بیٹھا سار جٹ ریش سے دنیا کی بدترین عورتوں کے متعلق گفتگو کر رہا تھا۔ مقصد شام کی تفریح نہیں تھا بلکہ وہ ڈریڈ کے ایک ساتھی صفر کا تعاقب کرتا ہوا یہاں تک آیا تھا۔ ہو سکتا ہے فریدی کے علاوہ فنج بھی اُس کی اصلیت سے واقف رہا ہو ورنہ عام آدمی تو اُسے کسی بڑی فرم کا کوئی کمیشن ایجنٹ سمجھتے تھے۔ وہ ایک خوش پوش اور بظاہر شائستہ آدمی تھا لیکن نہ خوش پوشی شرافت کا معیار ہے اور نہ شائستگی۔ بہر حال وہ ڈاکٹر ڈریڈ کے ساتھیوں میں سے تھا اور آج فریدی نے حمید کو اس کے پیچھے لگا دیا تھا۔ لیکن حمید کو مقصد کا علم نہیں تھا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ ڈریڈ کے ساتھیوں میں سے ہے۔

صفر شہر کے ایک بڑے آدمی کے ساتھ تھا اور اُن کے انداز سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ دوستوں کی حیثیت سے گفتگو کر رہے ہوں۔ حمید ان کی گفتگو کا ایک ایک لفظ سن سکتا تھا کیونکہ وہ اُس کے پیچھے والی میز پر تھے۔

کچھ دیر بعد اُسے لیڈی انسپکٹر ریکھا اور قاسم نظر آئے۔ وہ ہال میں داخل ہو رہے تھے۔ ریکھا کو قاسم کے ساتھ دیکھ کر حمید کو بڑی حیرت ہوئی اور ریش نے بھی تعجب ظاہر کیا۔ لیکن وہ دونوں خاموش

بیٹھے رہے۔ قاسم اور ریکھانے انہیں دیکھ تو لیا تھا لیکن ان کی طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے۔

حمید کھٹک گیا۔ وہ اس کی میز کے قریب ہی کی ایک میز پر آ بیٹھے۔ لیکن پھر بھی انہوں نے ان کی طرف دیکھنے کی زحمت نہیں گوارا کی۔ حمید سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ ریکھا عموماً اُسے زک دینے کی تاک میں رہا کرتی ہے۔

قاسم نے شاید کھانے کا آرڈر دیا تھا کیونکہ اُس کی میز سے ایک میز اور ملائی جا رہی تھی۔ اُس کے کھانے کا آرڈر عموماً اتنا ہی لمبا ہوا کرتا تھا کہ کم از کم دو میزیں یقینی طور پر بھر جاتی تھیں۔

ریکھا اور وہ دونوں آہستہ آہستہ گفتگو کرتے رہے۔ اُس کے برخلاف حمید اور رمیش اونچی آوازوں میں بول رہے تھے۔ لیکن اب بھی اُن میں سے کوئی بھی ریکھا یا قاسم سے مخاطب نہیں ہوا تھا۔ یہی حالت اُن دونوں کی بھی تھی۔

مگر حمید غافل نہیں تھا وہ سمجھتا تھا کہ ریکھا کی موجودگی یقینی طور پر کسی نہ کسی فتنے کا پیش خیمہ ہے۔ قاسم کی میزوں پر پلیٹیں لگائی جانے لگی تھیں اور ریکھا اُس سے ہنس ہنس کر گفتگو کر رہی تھی۔ قاسم بچھا جا رہا تھا۔ اُس کے ہر انداز سے مترشح تھا کہ یہیں اسی جگہ ”قربان“ ہو جائے گا۔ دونوں نے کھانا شروع کیا۔ لیکن حمید کی نظریں برابر قاسم کی طرف لگی رہیں۔

اچانک وہ بے تحاشہ اپنی میز پر اوندھا ہو گیا اور چاول کی ایک بڑی پلیٹ اُس کے اوپر سے گذرتی ہوئی صفدر کے منہ پر پڑی۔

ہال میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ وہ میز تو الٹ ہی گئی جس پر صفدر تھا۔ لوگ چاروں طرف سے اٹھے۔ اب حمید نے دیکھا تو ریکھا کو چکر ہو چکی تھی اور قاسم حیرت سے منہ پھاڑے بیٹھا تھا اور منہ میں ٹھنسنے ہوئے چاول اُس کی گود میں گر رہے تھے۔

”اب کیا سچ تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ صفدر کا ساتھی گرج رہا تھا۔ ”اُس دن پرویز پر پلیٹ پھینکی تھی.... اور آج....!“

”قاسم بدستور بیٹھا رہا اور اُس کے کھلے ہوئے منہ سے چاول گرتے رہے۔ حمید اور رمیش درمیان کی میز سے اٹھ گئے تھے۔

”یہ کیا ہوا۔“ رمیش نے آہستہ سے پوچھا۔

”گول رہو۔“ حمید نے جواب دیا اور رمیش کا ہاتھ پکڑ کر اُسے بھیڑ سے نکالتا ہوا سبھوں کے

بچے آگیا۔

”پولیس....!“ صفدر کا ساتھی دھاڑا۔ ”پولیس کو فون کرو۔“

پولیس کا نام سن کر قاسم جلدی جلدی منہ چلانے لگا اور پھر بچے کچھے چاولوں کو حلق سے اُتار کر بکھلایا۔ ”پپ.... پولیس ہی نے پلیٹ.... پھکوائی تھی۔“

”پاگل خانے بھجواؤ۔“ بیک وقت کئی آوازیں آئیں۔

”قون سالو.... بھجوائے گا۔“ قاسم اچھل کر کھڑا ہو گیا اور اس طرح اچھلتے وقت دونوں میزیں الٹ گئیں۔ قریب کے دو چار لوگ اگر بڑی پھرتی سے پیچھے نہ ہٹ گئے ہوتے تو انکا زخمی ہو جانا لازمی تھا۔ اتنے میں دو تین کانشیل ہال میں گھس آئے۔ شاید منیجر نے سڑک پر سے ڈیوٹی کانشیلوں کو بلوایا تھا۔

”کھسک چلو اب یہاں سے ورنہ بدنامی ہوگی۔“ حمید آہستہ سے بولا۔

اور وہ دونوں چپ چاپ باہر نکلے آئے۔

”یہ ریکھا کی بچی بڑی چالاک بنتی ہے۔“ حمید نے کہا۔

”کیا اُسی نے اُس کو اکسایا تھا۔“ رمیش نے پوچھا۔

”قطعاً.... وہ پلیٹ دراصل مجھ پر پھینکی گئی تھی۔“

”آہا....!“ رمیش ہنس پڑا۔ ”اسی لئے وہ کھسک بھی گئی۔“



دوسری صبح کے اخبارات نے قاسم کو سچ پاگل قرار دے دیا۔ کیونکہ اُس کی سنائی ہوئی کہانی پر کسی کو یقین نہیں آیا تھا۔ کون باور کر لیتا کہ لیڈی انسپکٹر ریکھا نے کیپٹن حمید پر چاول کی پلیٹ پھکوائی ہوگی۔ بعض اخبارات نے قیاس آرائی بھی کی تھی کہ سعیدہ رحمان کے اغواء میں حقیقتاً قاسم ہی کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ اسی لئے اب وہ دوسروں پر بھی پلیٹیں پھینک پھینک کر خود کو پاگل ثابت کرنا چاہتا ہے۔

لیکن اُسی شام کے ایک اخبار نے پرویز کا بیان شائع کر دیا۔ جو اپنی نوعیت کا ایک ہی تھا۔ پرویز نے کہا تھا۔

”نہ قاسم پاگل ہے اور نہ میں ہی دیوانہ ہوں۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ حکمہ

سراخ رسانی کے سب سے مشہور آفیسر کرنل فریدی کا ذہنی توازن بگڑ گیا

ہے۔ کیا میری اس کہانی پر کسی کو یقین آئے گا کہ اُسی آفیسر نے مجھے شراب

پلا کر خان بہادر عاصم کی کونھی پر بیجھا تھا اور ہدایت کی تھی کہ میں عاصم صاحب کی جتنی بے عزتی کر سکتا ہوں کروں۔ کوئی نہیں یقین کرے گا.... اخبارات اس بیان پر بھی شبہ ظاہر کریں گے اور ہو سکتا ہے کہ کوئی جیالا یہ بھی لکھ ڈالے کہ اس طرح میں اور قاسم سعیدہ رحمان کو بانٹ کھانا چاہتے ہیں۔ مگر میں محکمہ سراغ رسانی سے سوال کرتا ہوں کہ مجھے اس دیوانگی کا مطلب سمجھایا جائے ورنہ ہو سکتا ہے کہ مجھے آگے کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑے۔“

کرٹل فریدی نے اس بیان کو پڑھ کر ایک طویل سانس لی اور مسکرا کر بولا۔ ”ریکھانے کچا کچا پکچا رات ایک بڑا شاندار کارنامہ انجام دیا۔“

”اس پر حمید کے نکوؤں سے لگی اور سر پر بھیجی۔“ اُس نے بڑا سامنے بتا کر کہا۔ ”اگر یہی حرکت اُس سے سرزد ہوتی تو میں پرے سرے کا گاؤں اور گھامڑ قرار دیا جاتا۔ ریکھا.... ریکھا ہی ٹھہری۔ میں اس کی طرح پلک کر نہیں چل سکتا۔ نگاہوں سے بجلیاں نہیں گرا سکتا۔ اس طرح نہیں مسکرا سکتا کہ بہار! لہلہا اٹھیں۔“

”بہاریں نہیں کھیتیاں لہلہا کرتی ہیں فرزند!“

”سند ہے۔ اردو کے عظیم شاعر فراق نے کہا ہے۔ بہار جیسے لہلہاے.... ویسے لہلہانا بجائے نور ایک مصحح خیر لفظ ہے۔“

”میں الفاظ پر بحث کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔“

”تو میں ریکھا کی شان میں قصیدے ہی پڑھتا رہوں۔ اچھا تو سنئے۔“

”بس!....“ فریدی ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”بکواس نہیں۔“

”کیا مصیبت ہے۔ شاعری پیش کر دوں تو لکھو اس ہے۔ نثر میں کچھ کہنا چاہوں تو بکواس ہے۔ آخر آپ کیا چاہتے ہیں۔ کتوں کی طرح بھونکا کروں یا گدھوں کی طرح رینکا کروں۔“

فریدی کچھ نہ بولا۔ اس کے سامنے سنگرام سے ملی ہوئی فہرست پڑی تھی۔

”تو یہ آدمی تھا پچھلی رات صفدر کے ساتھ۔“ اُس نے ایک نام پر پنسل سے نشان لگاتے ہوئے کہا۔ ”اس بُری طرح ماروں گا کہ ڈاکٹر ڈریڈ زندگی بھر یاد رکھے گا۔“

”ہائیں تو کیا بچ۔ اس اغواء میں اُسی کا ہاتھ ہے۔ مگر وہ اس سے کیا فائدہ اٹھا سکتا ہے؟“

”جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں۔ بہت بڑا فائدہ۔“

## لڑکی اور لاش

لیڈی انسپکٹر ریکھانے قاسم کا بیان جھٹلایا اور فریدی نے پرویز کا۔ کئی دن تک اخباری بحثیں چلتی رہیں اور پھر سناٹا ہو گیا۔ فریدی نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ سعیدہ رحمان کے اغواء کے ذمہ دار قاسم اور پرویز دونوں ہی ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے ان دونوں نے مل کر کوئی اسکیم بنائی ہو۔

لیکن صفدر نے قاسم کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں کی تھی۔ حمید کیلئے یہ چیز باعث حیرت تھی۔

دیے وہ جانتا تھا کہ جب تک فریدی کی زبان نہیں کھلے گی اُس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹنے ہی رہیں گے۔

اور اب تو اُسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ فریدی اپنا زیادہ تر وقت کہاں گزارتا ہے وہ صبح آفس جاتا

اور آفس سے جو عائب ہوتا تو پھر کافی رات گئے گھر پر ملاقات ہوتی۔ آج کل نہ وہ حمید کو کسی بات پر ٹوکتا تھا اور نہ اس سے کوئی کام ہی لیتا تھا۔ غالباً اُسے اُس کو ٹوکنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔

حمید چین کر رہا تھا۔ راوی عیش لکھتا تھا ان دنوں۔

اور انہیں دنوں کی بات ہے کہ شہر میں فیشن ایبل بکروں کی بہتات ہو گئی تھی۔ کالجوں کے طلباء نے

بکرے پالنے شروع کر دیے تھے اور انہیں ان کے جدید ترین لوازمات سمیت ساتھ لئے پھر کر رہے

تھے۔ یہ بکرے کبھی کبھی سڑکوں پر لڑ پڑتے اور ٹریفک بند ہو جاتا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ یہ بکرے آؤٹ

آف کنٹرول ہو جاتے اور اُن کے مالکوں کو خواہ مخواہ فروشوں اور حلوایوں کو تادان بھی ادا کرنا پڑتا۔ مگر فیشن

ایبل بکروں کی تعداد میں کمی نہیں ہوتی تھی۔

ہیتیرے شرفانے فلت ہیٹ پہننا اور ٹائی لگانا چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہ ایسی حالت میں بکروں سے

آنکھیں نہیں چار کر سکتے تھے۔ ان بچاروں کے پاس اتنے عمدہ فلت اور ٹائیاں نہیں تھیں کہ وہ بکروں کی

کچا دھج کا مقابلہ کر سکتے۔

وہ صرف اتنا ہی کر سکتے تھے کہ کیپٹن حمید کو بددعا میں دیتے رہیں جس سے یہ چلن نکالا تھا۔ سینما

ہالوں اور دوسری تفریح گاہوں کے منتظمین تو اُسے اٹھتے بیٹھتے گالیاں دیا کرتے تھے کیونکہ فیشن ایبل

بکروں کی وجہ سے بعض اوقات انہیں بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ طلباء مصر ہوتے کہ اُن کے

ساتھ اُن کے بکرے بھی راجکو رکی بے ہنگم اچھل کود سے محفوظ ہونے کا پورا پورا حق رکھتے ہیں وہ بھی

تھے پاس ہی اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ حمید نے بھی اپنی کار اشارت کی اور اسی کے پیچھے چل پڑا۔  
کچھ دیر کے بعد وہ کار آرکچو کی کپاؤنڈ میں رکی۔ سنگرام کے ساتھ وہ لڑکی بھی اتری۔ وہ تینوں  
میں داخل ہوئے۔ کتے کو کار میں بند کر دیا گیا تھا۔ حمید نے اپنی کار اسی کے قریب کھڑی کر دی اور  
نیپلز کر کار کو مقفل کر دیا۔ کتا دوسری کار میں بے بسی سے اچھل کود رہا تھا اور بکرے نے کچھ اس انداز  
میں بھیدگی سے جگلی شروع کر دی تھی جیسے ”بچوں کی باتوں کا برا نہیں مانا کرتے۔“

حمید نے ہال میں قدم رکھتے ہی چاروں طرف دیکھا لیکن ان کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ریکریشن ہال سے  
ہستی کی مدہم سی آواز آرہی تھی۔ حمید کے قدم ادھر ہی اٹھ گئے۔ ممکن ہے وہ ریکریشن ہال ہی میں ہوں۔  
اس کا خیال صحیح نکلا۔ وہ وہیں تھے۔ حمید نے انہیں بائیں جانب والی گیلری میں بیٹھے دیکھا اور خود  
بھی اسی طرف چل پڑا۔ ان کے قریب ہی کی ایک میز خالی تھی۔ حمید نے سنگرام پر ایک اچھتی سی نظر ڈالی  
اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ سنگرام کی پشت اس کی طرف ہو گئی تھی مگر وہ لڑکی سامنے ہی تھی۔ حمید پائپ میں  
تبا کو بھرنے لگا۔ مگر لڑکی بہت زیادہ مضطرب نظر آرہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ وہاں بیٹھنا نہیں  
چاہتی۔ اُس کے برخلاف بوڑھی عورت کا چہرہ بہت پرسکون نظر آرہا تھا۔ اس کی نظر ایک بار حمید کی  
طرف اٹھی۔ اس کے ہونٹ خفیف سے کھلے اور پھر وہ بے اختیار مسکرا پڑی۔ حمید نے اُسے آگے جھک  
کر آہستہ سے کچھ کہتے دیکھا اور لڑکی اُسے غور سے دیکھنے لگی لیکن سنگرام اُس کی طرف نہیں مڑا۔  
بوڑھی عورت حمید میں بہت زیادہ دلچسپی لے رہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اُس سے گفتگو  
کرنے کے لئے بے چین ہو۔ ان کی میزوں میں زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔

دفعتاً بوڑھی عورت نے کہا۔ ”اگر آپ تنہا ہوں تو اس میز پر آ جائیے۔“  
”اوہ شکریہ.....!“ حمید اٹھتا ہوا بولا۔ اس کی دانست میں اس کی ٹیلی بیٹھی کام آگئی تھی۔  
وہ بوڑھی عورت کے قریب بیٹھ گیا۔ سنگرام کچھ نزوس سا نظر آنے لگا تھا جس کی وجہ کم از کم حمید کی  
کچھ میں نہ آ سکی کیونکہ سنگرام اس سے پہلے ہی فریدی کی لسٹ پر آچکا تھا اور اسے اس کا علم بھی تھا۔  
”آپ کی کار میں بکرا دیکھ کر مجھے بڑی ہنسی آئی تھی۔“ بوڑھی عورت نے کہا۔  
”لیکن آپ کی کار میں کتا دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی۔“ حمید بولا۔ ”میں نہیں سمجھ سکتا کہ لوگ کتا  
کیوں پالتے ہیں۔“

”اچھا۔ مجھے فی الحال اجازت دیجئے۔“ سنگرام بول پڑا۔ ”میں طبیعت میں کچھ گرانی محسوس کر رہا ہوں۔“

فلموں میں پیش کئے جانے والے سماجی مسائل پر تنقیدگی سے جگلی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ بھی اُس نزل  
آنسو بہانا چاہتے ہیں جو ہر فلم کی ہیروئن محبوب سے بچھڑ جانے پر سیاہ کپڑے پہن کر سناتی ہے۔  
انہیں دنوں کی ایک شام کا ذکر ہے کہ حمید اپنے بکرے سمیت فریدی کی ایئر کنڈیشنڈ لنگن میں  
کر رہا تھا۔ بکرا بچھلی نشست کی کھڑکی سے سر نکالے ان بکروں پر حقارت بھری نظریں ڈالتا جا رہا تھا  
اُس کی طرح ایئر کنڈیشنڈ گاڑیوں میں سفر نہیں کر سکتے تھے۔ اچانک ایک خونخوار قسم کا السیشن کار سے  
پیچھے دوڑنے لگا۔ چونکہ یہ شہر کی ایک پھری پڑی سڑک کا واقعہ تھا اس لئے حمید کار کی رفتار تیز نہ کر سکا۔  
نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بار کتے نے بکرے پر چھٹا مارا۔ بکرے نے بوکھلا کر سر اندر کرنا چاہا لیکن اس کی  
سینکلیں کھڑکی کے اوپری حصے سے لگ کر رکاوٹ بن گئیں۔ وہ بڑی کر بناک آواز میں چیخا اور حمید نے  
کار سڑک کے کنارے لگا کر روک دی۔ کتا آدھے دھڑ سے کار میں گھس آیا اور بکرے نے کسی سبھی ہوئی  
محبوبہ کی طرح حمید کے بائیں شانے پر تھو تھو رکھی دی۔

حمید نے کتے کے سر پر ایک زوردار گھونٹہ رسید کر دیا اور کھڑکیوں کے شیشے چڑھا کر کار سے نیچے  
اتر آیا۔ کتا اب بھی اچھل اچھل کر کار پر حملے کر رہا تھا۔ حمید چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا۔ کئی راہ گیر بھی  
رک گئے تھے۔ ان میں ایک آدھ بکروں کے ہمدرد بھی تھے۔ انہوں نے حمید سے کہا بھی کہ اُسے اس  
فاشی کتے کے خلاف کوئی سخت کارروائی کرنی چاہئے لیکن حمید شائد کتے کے مالک کا منتظر تھا۔  
یہ ایک اونچا السیشن کتا تھا اور اُس کے گلے میں پڑے ہوئے پنے اور پیتل کے میوہیل پاس سے  
ظاہر تھا کہ وہ کسی بڑے گھرانے کا فرد ہے۔

دفعتاً ایک چھوٹی سی کار وہاں آ کر رکی اور ایک ادھیڑ عمر کی سفید فام عورت کتے کو آواز دیتی ہوئی  
کار سے اتر آئی۔

”معاف کیجئے گا۔“ عورت نے حمید سے کہا۔ ”یہ کتا کار سے کود کر بھاگا تھا۔“

لیکن جیسے ہی اُس کی نظر حمید کی گاڑی میں بیٹھے ہوئے بکرے پر پڑی وہ بے تحاشہ ہنسے گی۔ لیکن  
حمید کو اب بکرے کتے اور اُس بوڑھی عورت سے کوئی دلچسپی نہ رہ گئی تھی کیونکہ عورت کی کار کی بچھلی نشست  
پر اُسے سنگرام نظر آ گیا تھا اور اُس کے برابر بیٹھی ہوئی لڑکی بلاشبہ بے حد حسین تھی لیکن وہ بھی غیر ملکی ہی  
تھی۔ سنگرام حمید کو ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے اس کا اس طرح دیکھ لیا جانا اُسے پسند نہ آیا ہو۔  
بوڑھی عورت کتے کا پتہ پکڑے ہوئے اُسے اپنی کار کی طرف لے جا رہی تھی۔ اُسکی کار روانہ ہو گئی۔

”اوہ بیٹھے نا۔“ بوڑھی عورت بولی۔

”کچھ دیر کے لئے کھلی ہوا چاہتا ہوں۔ پھر میں واپس آ جاؤں گا۔“ سنگرام نے کہا اور جواب انتظار کئے بغیر اٹھ گیا۔ حمید اُسے جاتے دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ اب اُس کے چہرے پر اضطراب کے آثار نہیں تھے۔

”یہ واقعی ایک دلچسپ جدت ہے۔“ بوڑھی عورت نے حمید کو مخاطب کیا۔

”آپ کیا کرتے ہیں۔“

”میں ایک طالب علم ہوں۔“

”یہ میری بھتیجی سارہ ٹرگس ہے۔“ بوڑھی نے لڑکی طرف دیکھ کر کہا۔

”اور میں حمید ہوں۔“ حمید نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ دونوں نے رسمی جملے کہے اور سیدھے بیٹھ گئے۔

حمید نے بوڑھی سے کہا۔ ”اب پڑھے لکھے لوگ عام طور پر بکرے پالنے لگے ہیں اور بکروں کی قیمتیں اونچی ہو گئی ہیں۔“

”میں نے اکثر نوجوان کے ساتھ بکرے دیکھے ہیں۔ مگر میں کسی نہ کسی سے اس کا مقصد معلوم کرنے کے لئے بیٹاب تھی۔“

”بکرا پالنے سے دراصل بچت ہوتی ہے۔“ حمید نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”کیونکہ گوشت کے مقابلے میں گھاس بہت سستی ملتی ہے۔ کتا پالنے تو گوشت کا مسئلہ۔ پھر اُسے روزانہ نہلایئے دھلائیئے۔ بکرے کو کبھی نہ نہلایئے۔ اُسے کوئی شکایت نہ ہوگی۔ کہیں سفر میں ہوں اور کھانے کو کچھ نہ ملے تو بکرے کو ذبح کیجئے اور نہایت اطمینان سے کباب لگائیئے۔ آپ روزانہ کتے کا پیٹ بھرتی ہیں لیکن کیا وہ آپ کے لئے ایک وقت کا بھی کھانا مہیا کر سکتا ہے۔ ہرگز نہیں.... اور پھر بکرے کی صحبت آدمی کو حلیم اور بردبار بناتی ہے۔“

لڑکی بھی ہنس پڑی اور حمید دل ہی دل میں اپنے بکرے کو دعائیں دیتا رہا۔

”آپ بہت دلچسپ نوجوان معلوم ہوتے ہیں۔“

”بس نوجوان معلوم ہی ہوتا ہوں ورنہ بکرے کی صحبت نے مجھے سقراط بنادیا ہے۔“

”آپ واقعی بے حد دلچسپ ہیں۔“ لڑکی نے ہنستے ہوئے پہلو بدلا۔

”مجھے آج تک اس کا احساس نہیں ہو سکا۔“ حمید نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”مگر مجھے افسوس

ہے۔ میرے آتے ہی آپ کے ایک ساتھی یہاں سے اٹھ گئے۔“

”اوہ.... اس کی فکر نہ کیجئے۔“ لڑکی مبکرائی۔ ”مجھے دراصل نئے دوست بنانے کا بے حد شوق ہے۔“

”اگر آپ ایک بکرا پال لیں تو روزانہ نئے دوستوں کی تلاش میں زحمت نہ اٹھانی پڑے۔“

”وہ کیسے.... آپ تو مدلل گفتگو کے عادی معلوم ہوتے ہیں۔“

”جی.... لیکن اس کے لئے میرے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ ویسے میں محسوس یہی کرتا ہوں۔

بب سے بکرا ہاتھ آیا ہے میں نے دوست بنانا ترک کر دیا ہے۔ گھر سے بہت کم نکلتا ہوں۔ جب میں

واپس ہوتا ہوں تو مجھے اس کی آنکھوں میں اپنا مستقبل نظر آتا ہے۔ ان میں بہاریں رقص کرتی ہیں....

ہر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی سرگوشیوں میں کہہ رہا ہو یہی تمہاری منزل ہے واپس آ جاؤ.... واپس

جاؤ۔ پھر میرے کانوں میں گھنٹیاں سی جیتی ہیں۔ ہلکی ہلکی مترنم گھنٹیاں.... جو کبھی لوریاں بھی معلوم

ہوتی ہیں اور میں اس کی سیٹگوں پر سر رکھ کر سو جاتا ہوں۔“

حمید بڑے رومانی انداز میں بک رہا تھا اور وہ دونوں ہنس رہی تھیں۔

رہبانے کے لئے موسیقی شروع ہو گئی۔ حمید نے لڑکی سے رقص کی درخواست کی۔

”پہلے جا کر بکرے سے پوچھ آئیے۔“ لڑکی کہتے کہتے ہنس پڑی۔

”چونکہ میں اس کے ساتھ رقص نہیں کر پاتا اس لئے اُس نے اجازت دے رکھی ہے۔ کئی بار میں

نے کوشش کی ہے کہ اُسے اس ڈھب پر بھی لے آؤں لیکن وہ سیدھا کھڑا ہونے سے انکار کر دیتا ہے۔“

لڑکی ہنستی ہوئی کھڑی ہو گئی اور وہ رقص کرنے والوں کی بھیڑ میں آ گئے۔ حمید کا دماغ چوتھے

آسمان پر تھا۔

کچھ دیر تک وہ خاموشی سے ناچتے رہے پھر لڑکی نے کہا۔ ”ہمارے ساتھ جو یہ آدمی تھا کیا آپ

اُسے جانتے ہیں۔“

”نہیں تو.... میں کیا جانوں۔ اگر ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے تو وہ کبھی اس طرح اٹھ کر نہ

جاتا۔“ حمید نے جواب دیا۔

”معاف کیجئے گا۔ آپ بھی بار بار اُسے گھور رہے تھے۔ ویسے وہ بھی آپ کو دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔“

”بھئی مجھے اس کا احساس نہیں ہو سکا۔ ممکن ہے آپ درست کہہ رہی ہوں۔“

”آپ مجھے نہیں بتانا چاہتے۔“ لڑکی نے مغموں آواز میں کہا۔

”آپ بھی تو اُس کی موجودگی میں کچھ گھبرائی ہوئی سی نظر آ رہی تھیں لیکن اُس کے جاتے ہی آپ کے چہرے پر اطمینان بکھر گیا تھا۔ بولنے اب آپ خاموش کیوں ہیں۔“ حمید نے سوال کیا۔

لڑکی نے فوراً ہی جواب نہیں دیا۔ تھوڑی دیر بعد بولی۔ ”میں اُس سے ڈرتی ہوں اور وہ آپ سے ڈرتا ہے مجھے یقین ہے کہ وہ آپ سے خائف ہو کر اٹھ گیا تھا۔ تو پھر آپ کون ہیں۔“

”بکرے کا مالک اور ایک اداس طالب علم.... آہا... کہیں وہ میرے بکرے کو اڑا دینے کی تار میں نہ ہو۔“

”اب آپ بات اڑا رہے ہیں۔ آپ بتائیے کہ آپ کون ہیں۔ وہ آپ سے کیوں ڈر گیا تھا۔“

”لیکن آپ اُس سے کیوں ڈرتی ہیں۔“

”وجہ ہے۔“

”تو اس کی بھی کوئی نہ کوئی ضرور ہوگی۔“

”میں اُسے معلوم کرنا چاہتی ہوں۔“

”یہی جملہ میری طرف سے بھی اپنے لئے کہہ لیجئے۔“

”کیا آپ کوئی پولیس آفیسر ہیں۔“ لڑکی نے اچانک سوال کیا۔

”کیوں؟ کیا وہ کوئی بُرا آدمی تھا جو پولیس آفیسروں سے خائف ہو سکے۔“

”یقیناً وہ ایک بُرا آدمی ہے۔“

”اور آپ کو بلیک میل کرنے کے چکر میں ہے.... کیوں؟“

”تو آپ اُسے جانتے ہیں۔“ لڑکی نے ایک طویل سانس لی۔ ”اور وہ آپ سے خائف تھا اس لئے میں آپ کو کوئی بڑا پولیس آفیسر ہی سمجھ سکتی ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ آپ پر اعتماد کر لوں۔ کیا آپ مجھے اُس کی دستبرد سے بچا سکتے ہیں۔“

”یہ بکرے کی موجودگی ہی میں ممکن ہے ورنہ وہ مجھ سے شکوہ کرے گا۔“

”اچھی بات ہے۔“ لڑکی اپنا اوپری ہونٹ بھیج کر بولی۔ ”اگر میں ناچتے ناچتے آپ کو پرے دھکیل کر چیخے لگوں تو کیسی رہے۔“

”اوہو....!“ حمید مسکرایا۔ ”آپ تو اس بلیک میل کی بھی چچی معلوم ہوتی ہیں۔ خیر آپ بتائیے کہ

یہ لڑکی

آپ کو کیوں بلیک میل کر رہا ہے۔“

”پہلے آپ بتائیے کہ آپ کون ہیں۔“

”اگر میں یہی کہہ دوں کہ میں ایک پولیس آفیسر ہوں تو اس کیلئے میرے پاس دلیل کیا ہوگی۔ میری

بیانی پر تو اس قسم کی کوئی تحریر ہے نہیں جو میرے بیان کی تصدیق کر سکے۔ آپ کیسے یقین کر لیں گی۔“

”میں یقین کر لوں گی کیونکہ میرا دل بہت دیر سے یہی کہہ رہا ہے۔“

”اچھا تو میں ایک پولیس آفیسر ہوں۔ اور وہ بلیک میل مجھے اچھی طرح پہچانتا ہے۔“

”شکریہ! اب میں آپ کو اپنی کہانی سناسکتی ہوں۔ لیکن ساتھ ہی آپ کی شرافت سے یہ توقع بھی

ہوئی گی کہ آپ اس کا تذکرہ کسی سے بھی نہیں کریں گے۔ میری پھوپھی کو اگر اس کا علم ہو گیا تو میرا

مستقبل برباد ہو جائے گا۔“

”آپ مطمئن رہئے ایسا نہیں ہو سکے گا۔“

”میری پھوپھی... مسز بلفرائی ایک دولت مند خاتون ہیں۔ ممکن ہے آپ نے انکا نام پہلے بھی سنا ہو۔“

”میں نے سنا ہے۔ یہاں ان کے کئی کاروبار ہیں۔ اوہ تو یہ مسز بلفرائی ہیں۔“

”جی ہاں.... میں اُن کی تنہا وارث ہوں.... وہ میری شادی لندن کے ایک متمول گھرانے میں کرنا

چاہتی ہیں اور مجھے بھی یہ رشتہ برائ نہیں لگتا کیونکہ گی مجھے بہت پسند ہے۔ ہم ایک دوسرے کے گہرے

دوست بھی ہیں اور گی بھی مجھ سے شادی کرنے کی خواہش رکھتا ہے۔“

”ہاں تو خاموش کیوں ہو گئیں۔“

”اس آدمی کے ہاتھ میرے کچھ خطوط لگ گئے ہیں۔ جن سے غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں حالانکہ

وہ کسی بُرے ارادے سے نہیں لکھے گئے تھے۔ مگر یہ سب پہلے ہی میرا ایک دوست تھا لیکن ہم دونوں میں

صرف ذہنی رشتہ تھا۔ میں نے وہ خطوط اُسی کو لکھے تھے۔ بہر حال وہ کسی طرح اس آدمی کے ہاتھ لگ

گئے ہیں اور وہ مجھے بلیک میل کر رہا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ اگر وہ خطوط منظر عام پر آ گئے تو مگر

میری شادی نہ ہو سکے گی اور کچھ تعجب نہیں کہ میں پھوپھی کے ترکے سے بھی محروم ہو جاؤں کیونکہ وہ بھی

اسے پسند نہ کریں گی۔ وہ ایک ضدی طبیعت کی عورت ہیں جو کچھ اُن کے ذہن میں بیٹھ جائے اس کا

نقٹا قریب قریب ناممکن ہو جاتا ہے۔“

”وہ آپ کو کب سے بلیک میل کر رہا ہے۔“

”تقریباً چھ ماہ سے۔“

”کافی رقم اب تک وصول کر چکا ہوگا۔“

”کافی سے بھی زیادہ۔“

”خیر! اب نہ کر سکے گا۔ اُسے جلد ہی آپ کی راہ سے ہٹا دیا جائے گا۔ لیکن آپ کی پھوپھی اُسے کس حیثیت سے جانتی ہیں۔“

”میرے ایک ملنے والے کی حیثیت سے۔ اور وہ اسی طرح میرے سر پر سوار رہتا ہے۔“

”بہت جلد..... آپ فکر نہ کیجئے۔“

”میں ہمیشہ آپ کی احسان مند رہوں گی۔“

”احسان مند رہنے سے مجھے کیا فائدہ ہوگا۔“ حمید نے مایوسی سے کہا۔

”پھر..... پھر..... آپ کیا چاہتے ہیں۔“ لڑکی ہٹکائی۔

”ایک قربانی!۔“

”کیا میں نہیں سمجھی۔“ لڑکی کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔

”کتا فردخت کر کے ایک بکرا خرید لیجئے۔ اس طرح آپ مجھے لندن میں بھی یاد رکھ سکیں گی اور میری اس ”بکرا پسند“ تحریک کی اشاعت بھی ہوتی رہے گی۔“

”لڑکی ہنسنے لگی..... اس نے کہا۔“ میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔“

”مگر بکرا نہیں رکھیں گی..... کیوں؟“ حمید نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

اچانک آرکسٹر خاموش ہو گیا اور ہال کے ایک حصے میں بد نظمی سی نظر آنے لگی۔ پھر یہ بد نظمی اچھے خاصے ہنگامے میں تبدیل ہو گئی۔

”قتل ہو گیا۔“ ایک آدمی نے کہا اور دوڑتا ہوا حمید سے ٹکرایا تھا۔

”کیا؟“ لڑکی نے حیرت سے کہا۔

”قتل ہو گیا۔“ حمید نے جواب دیا۔

اچانک لاؤڈ سپیکر بے کسی کی آواز آئی۔ ”خواتین و حضرات! آپ جہاں بھی ہیں وہیں تشریف رکھیں سارے دروازے پولیس نے بند کرادیئے ہیں۔ آپ باہر نہ جاسکیں گے۔“

”کیوں نہ جاسکیں گے۔“ بہت سی آوازیں بیک وقت ہال میں گونجیں۔

”اوپری منزل کے ایک غسل خانے سے ایک لاش برآمد ہوئی ہے۔“ لاؤڈ سپیکر سے آواز آئی۔

”میرے خدا قتل!.....!“ لڑکی کانپنے لگی۔

”اب باہر جانا مشکل ہوگا۔ آپ وہیں اپنی میز پر بیٹھئے۔“

”آپ کہاں جا رہے ہیں۔“

”ابھی آیا..... چلے..... بیٹھئے۔“

حمید اُس کو بوڑھی کے پاس چھوڑ کر ڈائیننگ ہال میں پہنچ گیا۔ یہاں سچ مچ پولیس موجود تھی۔

”انچارج کون ہے۔“ حمید نے ایک کانسٹیبل سے پوچھا جو اُسے پہچانتا تھا۔

”جگدیش صاحب۔“ اُس نے اُسے سلیوٹ کر کے جواب دیا۔ ”وہ اوپر ہی ہیں جناب۔“

حمید زینے طے کر کے اوپر پہنچا۔ پہلی ہی منزل کی راہداری میں بھیڑ نظر آئی۔ وہیں ایک غسل

خانے میں لاش اونگھی پڑی ہوئی تھی اور ایک خنجر دل کے مقام پر دسے تک پیوست تھا۔ حمید کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں کیونکہ یہ سنگرام کی لاش تھی۔

وہ جگدیش کے کسی سوال کا جواب دیئے بغیر نیچے واپس آیا اور نیچر کے کمرے میں جا کر ان مقامات

کے نمبر ڈائریل کرنے کا ارادہ کیا جہاں فریدی سے ملاقات ہو سکتی تھی لیکن وہ خلاف توقع گھری پرل گیا۔

”سنگرام یہاں آرکچو میں ابھی ابھی قتل کر دیا گیا۔“ حمید نے کہا۔

”اوہ!.....“ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ ابھی قتل کیا گیا ہے۔“

”کچھ دیر پہلے وہ اسی میز سے اٹھا تھا جس پر میں تھا۔“

”کیا مطلب! تم اُس کے ساتھ تھے۔“ فریدی کی آواز میں حیرت تھی۔

”نہیں وہ جس لڑکی کے ساتھ تھا میں اُس لڑکی!.....!“

”لڑکی کے بچے۔“ فریدی غرایا۔ ”تم میرا کام چوہٹ کرتے رہتے ہو۔ اُس کی موت کی تمام تر

ذمہ داری تم پر ہے۔ وہیں ٹھہرو..... میں آ رہا ہوں۔“

حمید بوکھلا کر نیچر کے کمرے سے نکل ہی رہا تھا کہ وہ لڑکی آنکرائی شائد وہ اُسے تلاش کرتی پھر

رہی تھی۔

”آپ کہاں ہیں۔ مجھے ڈر معلوم ہو رہا ہے۔“

”اب تم زندگی بھر کے لئے مطمئن ہو جاؤ۔ وہ مار ڈالا گیا۔ وہی جو تمہیں بلیک میل کر رہا تھا۔“



”نہیں!۔۔۔“ لڑکی سنائے میں آگئی۔

”ہاں۔۔۔ وہی۔۔۔ لیکن اب تم خدا کے لئے اپنی میز پر جاؤ۔ میرا ظالم قادر آ رہا ہے۔ اگر وہ نہ آئے تب بھی اگر کسی نے اشارہ بھی کر دیا کہ وہ تمہاری میز سے اٹھا ہے تو تم لوگ بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گی۔۔۔۔۔ جاؤ۔۔۔۔۔ جب دروازے کھلیں تو چپ چاپ نکل جانا۔“

لڑکی بوکھلائے ہوئے انداز میں چلی گئی۔

حمید فریدی کا انتظار کرتا رہا۔ وہ پندرہ منٹ بعد وہاں پہنچ گیا۔ لاش دیکھی اور پھر نیچے آ گیا۔ حمید نے خود ہی پوری داستان دہرائی۔ فریدی کا موڈ بہت زیادہ خراب نظر آ رہا تھا۔

”وہ دونوں کہاں ہیں۔“

”چلے دکھاؤں۔“ حمید اُسے ریکریشن ہال کے دروازے تک لے گیا اور اشارے سے ان دونوں کو دکھا کر کہا۔ ”وہ رہیں۔۔۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ لڑکی کے بیان میں کہاں تک صداقت ہے۔“

”ہاں۔۔۔ یہ مسز بلغرائی ہی ہے۔“ فریدی بڑبڑایا۔ ”خیر میں انہیں پھر دیکھوں گا۔ تم بالکل گدھے ہو۔ تمہیں علم تھا کہ میں سنگرام سے کام لے رہا ہوں۔“

”میں سنگرام کے چکر میں نہیں تھا۔“

”میں تم سے سمجھوں گا حمید۔ ایسی سزاؤں کا کہ زندگی بھر یاد رکھو گے۔“

فریدی نے کہا اور اُسے وہیں چھوڑ کر پھر ادوی منزل کی طرف چلا گیا۔

حمید ایک میز سے ٹکا کھڑا اپنی پیشانی رگڑتا رہا۔

## اور پھر کیا ہوا

حمید نے وہ رات نہ جانے کس طرح گزاری۔ فریدی رات بھر گھر سے غائب رہا۔ صبح واپس آیا تو اس کا موڈ پچھلی رات سے بھی زیادہ خراب تھا۔ نہ اُس نے حمید سے بات کی اور نہ اُسکی طرف متوجہ ہوا۔ حمید نے بھی چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اُسے بھی اپنی حماقت کا احساس ہو گیا تھا۔ جب اُسے معلوم تھا کہ فریدی اور سنگرام کے درمیان کسی قسم کا سمجھوتہ ہوا ہے تو اُسے اُس سے دور ہی رہنا چاہئے تھا۔ مگر بُرا ہوا اس صحنِ پرستی کا۔ اُس نے اُسے دو کوڑی کا آدمی بنا دیا تھا۔ ایسے ہی مواقع پر وہ تھوڑی دیر کے لئے عورتوں کے سلسلے میں فریدی کو ایک دانش مند ترین آدمی تسلیم کر لیتا تھا۔

فریدی اپنی خواب گاہ میں چلا گیا اور حمید کئے ہوئے پتنگ کی طرح ادھر ادھر ڈولتا رہا۔

کچھ دیر بعد اُسے ایک نوکر نے اطلاع دی کہ کوئی لڑکی جس کا نام سارہ ٹرگیس ہے اُسے فون پر بلا رہی ہے۔

”سارہ ٹرگیس۔“ حمید نے ایک جھرجھری سی لی اور بولا۔ ”اُس سے کہہ دو۔۔۔ کیپٹن حمید کو گولی ماری گئی۔“

”جی صاحب۔“

”اے بھگ۔۔۔ جی صاحب کا بچہ۔ جب بھی کسی عورت کا فون آئے کہہ دو کیپتان صاحب مر گئے۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔ گٹ آؤٹ۔“

نوکر چپ چاپ چلا گیا۔ غالباً آج یہ اس کے لئے ایک بالکل ہی نئی بات تھی۔

حمید اب اُسی لڑکی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ کون جانے سنگرام کے قتل میں اُسی کا ہاتھ ہو۔ وہ اُسے بلیک میل کر رہا تھا۔ ممکن ہے اُس سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا پانے کے لئے وہ یہ بھی کر گذری ہو۔ جو لڑکی مالی اعتبار سے اتنی مضبوط ہو کہ چھ ماہ تک کسی بلیک میلر کے مطالبات پورے کر سکے وہ اُسے قتل کر دینے کے لئے بھی معقول رقم خرچ کر سکتی ہے۔ لہذا فریدی کا یہ خیال غلط بھی ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر ڈریڈی اس قتل کا ذمہ دار ہے۔ اس نے فریدی کو سارہ کے متعلق سب کچھ بتا دیا تھا لیکن اُس نے اس سلسلے میں کیا کیا؟ حمید کو اس کا علم نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد وہ بھی اپنی خواب گاہ میں آگھسا۔ لیکن ابھی اُسے آفس جانا تھا۔ ہمت نہیں پڑی کہ فریدی سے اُس کے پروگرام کے متعلق پوچھتا۔

دس بجے وہ آفس چلا گیا لیکن ایک گھنٹے بعد فریدی کا فون آیا۔ اُس نے اُسے گھر واپس بلایا تھا۔ گھر پہنچتے ہی فریدی سے مڈ بھیڑ ہو گئی لیکن وہ اچھے موڈ میں تھا۔ حمید کو پہلے تو اس پر حیرت ہوئی مگر پھر اس کا وہ جملہ یاد آ گیا جو اُس نے بچپنی رات آکرچو میں کہا تھا یعنی وہ اسے کوئی سخت ترین سزا دے گا۔ ایسی جو زندگی بھر یاد رہے گی۔

”تمہیں فن آئی لینڈ جانا ہے۔“ فریدی نے اُس سے کہا۔

”چلا جاؤں گا۔“ حمید نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ ”آپ نے سارہ ٹرگیس کو چیک کیا یا نہیں۔ وہ سنگرام کو قتل کر دینے کی بڑی اہم وجہ رکھتی ہے۔“

”اسے چیک کیا جا رہا ہے۔ لیکن اُس کے قتل کا باعث ڈریڈ ہی ہو سکتا ہے کیونکہ میری ہی طرف سے  
نے بھی اُسے ایک کام کے لئے ڈریڈ کے خلاف استعمال کیا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ سنگرام ڈریڈ کے  
دوسرے ساتھیوں کی طرح کھپتی نہیں تھا بلکہ ڈریڈ سے اپنا پیچھا بھی چھڑاتا چاہتا تھا۔ اُس کے لئے اُس  
نے ڈریڈ کے متعلق معلومات فراہم کرنے کی کوشش بھی کی تھی اور کیا تمہیں علم ہے کہ اس کی لاش کے  
نیچے سے ایک پنل اور کاغذ کا ایک ٹکڑا بھی برآمد ہوا تھا۔

”نہیں.... میں نہیں جانتا۔“

”وہ تمہارے لئے ایک چٹ لکھ رہا تھا۔“

”میرے لئے....!“ حمید نے حیرت سے دہرایا۔

فریدی نے جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالا اور اُسے حمید کی طرف بڑھا دیا۔

پنل سے تین لائنیں گھسیٹی گئی تھیں اور تیسری نامکمل تھی۔

”پکتان صاحب۔ آخر آپ کیوں میری

زندگی کے گاہک ہوئے ہیں۔ کیا کرٹل صاحب کی

طرف سے آپ کو ہدایت مل.....

وہ غالباً ”ہدایت“ کے بعد ”ملی....“ لکھ رہا تھا اسی وقت اس پر حملہ ہوا اور ”ملی“ کی ”سی“ دائرہ نہ  
بنا سکی۔ دفعتاً حمید کے ذہن پر ہتھوڑے سے چلنے لگے اور وہ سچ سچ خود کو مجرم تصور کرنے لگا۔ سنگرام ایک  
بڑا آدمی سہی لیکن اُس نے ڈریڈ کے خلاف قانون کی مدد کرنے کا تہیہ کر لیا تھا حمید نے اس کے لئے  
ہمدردی کے جذبات محسوس کئے اور اُس کے چہرے پر اضمحلال نظر آنے لگا۔

”ڈریڈ اُسے قتل نہ کراتا۔“ فریدی کہہ رہا تھا۔ ”مگر وہ سعیدہ رحمان کے اغواء کے راز سے واقف  
ہو گیا تھا اس کی اطلاع اُسے فوج سے ملی تھی۔“

”تو یہ فوج حقیقتاً اب بھی یہاں موجود ہے۔“

”ہاں اُن دونوں کے درمیان کسی قسم کا جھگڑا چل رہا ہے۔“

کچھ دیر حمید خاموش رہا پھر بولا۔ ”جوزیرے میں مجھے کیا کرنا ہوگا۔“

”انتظار.... ایک اشارے کا منتظر رہنا پڑے گا تمہیں.... جو بڑے نیلے پر سے رات کو کسی وقت

تمہیں ملے گا اور تم نیلے کے قریب پہنچنے کی کوشش کرو گے۔ مجھے یقین ہے کہ ڈریڈ کا ہیڈ کوارٹر جوزیرے

میں کہیں ہے اور شہر سے رابطہ قائم رکھنے کے لئے وہی سفید کشتی استعمال کی جاتی ہے۔“

”میں آج آپ سے بحث نہیں کروں گا۔“ حمید نے کہا۔ ”لیکن وہ اشارہ کس قسم کا ہوگا۔“

”سرخ روشنی۔“ فریدی مسکرایا۔ ”نہیں تم شوق سے بحث کرو۔ مجھے پچھلی رات تم پر بہت شدت

ہے فہم آ گیا تھا لیکن اب مجھے یقین ہے کہ وہ اس لئے نہیں مارا گیا کہ تم اُس کے ساتھ تھے۔ اگر یہ

بات ہوتی تو قاتل یہ دیکھنے کی کوشش ضرور کرتا کہ وہ کاغذ پر کیا لکھ رہا تھا اور شاید کاغذ کا یہ ٹکڑا میرے

ہاتھ نہ لگ سکتا۔ وہ دراصل سعیدہ رحمان کے اغواء کے راز سے واقف ہو جانے کی بناء پر مارا گیا۔“

”شکر ہے۔“ حمید ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”میری گردن تو چھوٹی۔“

”تمہیں میک اپ میں فن آئی لینڈ جانا ہوگا۔“ فریدی غلاء میں گھورتا ہوا بولا۔



رات تاریک تھی۔ حمید کی کلائی کی گھڑی نے دس بجائے اور وہ پہلے سے بھی زیادہ مضطربانہ انداز

میں بڑے نیلے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ فرانی فٹ ریسٹوران کی ایک ایسی گھڑی کے قریب بیٹھا تھا جہاں

سے بڑا نیلے صاف نظر آتا تھا۔ چلتے وقت فریدی نے بھی اُس سے یہی کہا تھا کہ وہ فرانی فٹ ریسٹوران

سے بڑے نیلے پر نظر رکھ سکے گا۔

ریستوران میں صرف تین میزیں بھری ہوئی تھیں بقیہ خالی ہو چکی تھیں نو بجے تک جزیرے میں

عموماً چہل پہل رہا کرتی تھی اس کے بعد ہی سے وہ ویران ہونے لگتا تھا۔ لیکن یہاں بھی اکثر ایسے

ریستوران تھے جو رات بھر کھلے رہتے تھے۔ حمید شام سے یہیں بیٹھا رہا تھا اور اب اکتا گیا تھا۔ اُسے

اس کا بھی علم نہیں تھا کہ اشارہ کس سے ملے گا اور پھر نیلے کے قریب پہنچ کر اُسے کیا کرنا پڑے گا۔ وہ

بیٹھا رہا.... پھر ٹھیک گیارہ بج کر پانچ منٹ پر اُسے نیلے پر سرخ روشنی نظر آئی اور وہ اٹھ کر ریسٹوران

سے نیلے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اُسے وہ رات یاد آ رہی تھی جب اُس نے سنگرام کا تعاقب کیا تھا اور یہ

حقیقت ہی تھی کہ آپس میں جھگڑا ہو جانے پر وہ بقیہ ساتھیوں سے اسی لئے کٹ گیا تھا کہ کہیں پولیس

سے مدد بھی نہ ہو جائے۔ فریدی کو اس نے یہی بتایا تھا۔

حمید نیلے کے قریب پہنچ کر اوپر دیکھنے لگا۔ لیکن پھر یک بیک اچھل پڑا۔ کسی نے اس کے شانے پر

ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”ادھر آئیے۔!“ اُس کے پیچھے کھڑے ہوئے آدمی نے ایک طرف چلتے ہوئے کہا۔

”جے راستہ بند ہے جناب۔“ اگلی سیٹ سے آواز آئی۔

”روک دو۔“ حمید کے برابر بیٹھے ہوئے آدمی نے کہا۔ یہ فریدی ہی تھا۔

لاچ کی اگلی روشنی جاگ اٹھی اور اس کا دائرہ سامنے کی جھاڑیوں پر پڑا۔ بڑی بڑی کانٹے دار

جھاڑیاں اوپر سے اس طرح پانی پر جھک آئی تھیں کہ راستہ بند ہو گیا تھا۔

”ناممکن.....!“ فریدی چاروں طرف دیکھتا ہوا بڑبڑایا۔ ”واپس لے چلو۔ ممکن ہے ہم اُسے پیچھے

ی چھوڑ آئے ہوں۔“

لاچ پھر واپس ہوئی۔ فریدی نے اپنی ٹارچ نکال لی تھی اور حمید سے اس کے لئے کہا۔ اس طرح

”ٹارچوں کی روشنیاں دراڑ کے دونوں اطراف میں پڑنے لگیں اس بار لاچ کی رفتار نسبت تھی۔

کچھ دور چلنے کے بعد دفعتاً فریدی نے پھر لاچ رکوا دی۔ یہاں اس دراڑ میں سڑے ہوئے پانی کی بدبو

ناقابل برداشت تھی۔ حمید ناک پر رومال رکھے رک رک کر سانس لے رہا تھا۔ اس کے برخلاف

فریدی کے انداز سے معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ان گندگیوں کا عادی ہو۔

”آپ کیا تلاش کر رہے ہیں۔“ حمید نے آہستہ سے پوچھا۔

”ایک ایسی جگہ جہاں کوئی بڑی کشتی چھپائی جاسکے۔“ اس نے جواب دیا لیکن اُس کی ٹارچ کی

روشنی کا دائرہ ادھر ادھر گردش کرتا رہا۔ پھر چانک اُس نے ٹارچ بجھا دی۔

ٹھیک اسی وقت ایک ہلکی سی آواز آئی۔ حمید نے گھبرا کر اپنے پیر سکڑ لئے کیونکہ آواز پیروں کے

پاس ہی سے آئی تھی۔ مگر دوسری بار اُس نے محسوس کیا کہ وہاں ایک ٹرانسمیٹر موجود ہے جس نے کہیں

سے نشر ہونے والا کوئی اشارہ رسیور کیا تھا۔

”ہیلو.....!“ فریدی بولا۔ ”ایف پلیز.....!“

حمید دوسری طرف سے آنے والی آواز نہ سن سکا۔

”اوہ.....!“ فریدی کہہ رہا تھا۔ ”تمہیں دھوکا تو نہیں ہوا..... اچھا..... اچھا..... ادھر بھی دیکھتے ہیں۔

ادھر تو آگے جانے کا راستہ نہیں ہے۔“

حمید سمجھ گیا کہ فریدی کافی انتظام کے ساتھ اس مہم پر آیا ہے۔ فریدی کے کہنے پر لاچ پھر چل

پڑی۔ اگلی روشنی مکمل کر دی گئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ اس دراڑ سے کھلے پانی میں آگئے اور لاچ دہنی

جانب مڑ گئی۔ اب اس کی رفتار بہت تیز تھی۔ فریدی ٹرانسمیٹر سے نامعلوم آدمیوں کے لئے ہدایات نشر

حمید آواز سے پہچان نہ سکا کہ وہ کون ہے۔ دفعتاً اُسے فریدی کی بلیک فورس کا خیال آیا۔ کیا

اس سلسلے میں بھی اپنی پُر اسرار بلیک فورس ہی استعمال کر رہا ہے۔ وہ اُس کے ساتھ چلتا رہا۔ نیلے

نیچے ہی نیچے چل کر وہ اُس مقام پر پہنچے جہاں سے پانی کی طرف ڈھلان شروع ہوئی تھی۔

حمید کو نیچے اترنے میں دشواری پیش آرہی تھی کیونکہ اندھیرا تھا اور کہیں کہیں اُگی ہوئی جھاڑیاں

جھاڑیاں تاریکی میں غاروں کے دہانے معلوم ہو رہی تھیں۔ پھر پانی کی سطح اُن سے تھوڑے ہی فاصلے

پر رہ گئی۔ سمندر پر سکون تھا۔ لیکن پانی کی بساندھ سے حمید کا دماغ بھٹنے لگا۔ وہ بائیں جانب مڑے اور

کنارے کنارے چلنے لگے۔ یہاں زمین ریتیلی تھی اور حمید کو اپنے پیر دھنسنے معلوم ہو رہے تھے۔

رہبر آگے چل رہا تھا۔ ایک جگہ وہ رکا۔ حمید بھی رک گیا۔ اُسے تھوڑے فاصلے پر پانی میں ایک

لاچ نظر آئی اور رہبر آہستہ سے بولا۔ ”بیٹھ جائیے۔“

لاچ میں شاید کچھ آدمی اور بھی تھے۔ حمید لاچ پر بیٹھے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔

”میں عرض کر رہا ہوں لاچ میں بیٹھ جائیے۔“ اس نے پھر کہا۔

حمید نے آگے قدم بڑھائے اور لاچ سے آواز آئی۔ ”کیوں دیر کر رہے ہو۔“

آواز فریدی کی تھی۔ حمید چپ چاپ لاچ میں اتر گیا لیکن رہبر کنارے ہی کھڑا رہا اور لاچ چل

پڑی۔ حمید کنارے کھڑے ہوئے تاریک سائے کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ یک یک نظروں سے اوجھل ہو گیا

جیسے اُسے زمین نگل گئی ہو۔ حمید نے ہوا چا ممکن ہے وہ لیٹ گیا ہو۔

اب اُس نے لاچ کے اندر کا جائزہ لیا۔ ایک آدمی مشین کے سامنے تھا اور اس کے پیچھے حمید والی

نشست پر ایک آدمی اور تھا۔ لاچ میں کل چار آدمی تھے لیکن اندھیرا ہونے کی وجہ سے حمید اپنے برابر

بیٹھے ہوئے آدمی کے متعلق بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کون ہوگا۔ ویسے ان میں فریدی بہر حال

تھا کیونکہ حمید نے اُس کی آواز صاف پہچانی تھی۔

لاچ چلتی رہی اور دفعتاً حمید نے محسوس کیا جیسے یک یک گہرا اندھیرا ہو گیا ہو۔ وہ بوکھلا کر چاروں

طرف دیکھنے لگا لیکن کچھ بھائی نہ دیا۔ پھر اُس نے اوپر دیکھا اور اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ لاچ ”

اوپچی اوپچی دیواروں کے درمیان چل رہی ہو۔

حمید اوپر ہی کی طرف دیکھتا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی دونوں دیواروں کا درمیانی فاصلہ تنگ ہوتا ہوا بھی

معلوم ہونے لگتا۔ یہ لاچ بے آواز تھی۔

نے کی آواز آئی اور اب پھر وہی پہلے کا سا اندھیرا تھا۔  
 ”کیا کام کیا ہے فرزند... جیو“ فریدی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا پھر جلدی سے بولا۔ ”لیٹو... سب  
 بٹ جاؤ... رفتار بڑھاؤ... چلتے رہو۔“

پھر شانددہ اشین گن ہی کی آواز تھی جس سے فضا میں ہیجان سا برپا ہو گیا۔  
 بڑی کشتی سے ایک نارچ روشن ہوئی اور ساتھ ہی فریدی کے ریوالتور سے ایک شعلہ بھی نکلا اور  
 نارچ شانددہ ہمیشہ کے لئے بجھ گئی۔ کیونکہ اُس کے بجھے اور کسی کے چپنے میں زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔  
 اشین گن بھی خاموش ہو گئی۔ لیکن یہ سناٹا دیر تک قائم نہیں رہ سکا اور حمید کی ہانچیں بھی کھل گئیں کیونکہ  
 یہ بحری پولیس کی لانچوں کے ہوٹروں کی کثرت آوازیں تھیں جنہوں نے سنانے کا سیدہ چھلکی کر دیا تھا۔  
 پھر قریب ہی سے کچھ ایسی آوازیں آئیں جیسے پانی میں وزنی چیزیں پھینکی گئی ہوں۔

”یہ بُرا ہوا“ فریدی نے مضطربانہ انداز میں کہا۔ ”وہ کو دگئے۔ کچھ بھی نہ ہوا۔“

اس نے نارچ روشن کی۔ تھوڑے ہی فاصلے پر سفید کشتی ٹھہری ہوئی تھی۔

”لانچ موڑو... جلدی کرو“ فریدی نے کہا۔ ”یہ ہوڑا اب بھی چیخ رہے تھے۔ لیکن شانددہ بحری  
 پولیس کی کشتیاں دراڑ سے باہر ہی تھیں۔“

لانچ کشتی کے قریب آ گئی اور فریدی نے لانچ پر سے کشتی پر چھلانگ لگادی حمید نے بھی اُس کی  
 تقلید کی۔ لیکن کشتی خالی پڑی تھی۔ وہ پھر لانچ پر جانے کے لئے واپس ہو رہے تھے کہ کچھ اس قسم کی  
 آوازیں آئیں جیسے پانی میں دو چار کتے لڑ پڑے ہوں۔ نارچ کی روشنی کا دائرہ آوازوں کی طرف  
 رینگ گیا۔ تین آدمی اس طرح بار بار پانی سے سر اُٹھا رہے تھے جیسے غرقابی سے بچنے کے لئے جدوجہد  
 کر رہے ہوں۔

وہ کشتی کے قریب آ گئے اور اُن کے ہاتھ سہارا لینے کے لئے اٹھے۔ فریدی خاموشی سے کھڑا دیکھتا  
 رہا۔ پھر وہ کشتی پر چڑھ آئے۔ فریدی نے اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کی۔ اُن کی حالت ابتر تھی۔ وہ  
 کھڑے نہ رہ سکے۔ اُن میں سے ایک تو شانددہ گرتے ہی ختم ہو گیا تھا اور دو چت پڑے ہوئے گہری  
 گہری سانس لے رہے تھے۔

”ڈاکٹر ڈریڈ...!“ فریدی نے مردہ آدمی پر روشنی ڈالی۔

بحری پولیس کی لانچیں دراڑ میں داخل ہو رہی تھیں۔

کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد لانچ پھر ایک دراڑ میں داخل ہوئی لیکن حمید کو اپنے سر کے بال کی چیز سے الجھ  
 ہوئے محسوس ہونے لگے۔ جیسے اُس نے سر پر ہاتھ لے جانا چاہا ”سی“ کر کے رہ گیا۔ ایسا معلوم ہوا  
 جیسے بیک وقت سیکڑوں کانٹے ہاتھ میں چبھ گئے ہوں۔

”جھک جاؤ... جھک جاؤ... جھاڑیاں ہیں۔“ فریدی بولا۔ ”رفتار بہت کم کر دو۔“

”اُس نے بھی نارچ روشن کر لی تھی۔ لیکن پھر وہ جلد ہی سیدھے بیٹھنے کے قابل ہو گئے۔“

فریدی نے کہا۔ ”روک دو۔“ وہ نارچ کی روشنی میں پیچھے رہ جانے والی جھاڑیوں کا جائزہ لے رہا  
 تھا۔ یہ پانی کی سطح سے بمشکل تمام پانچ فٹ اونچی رہی ہوں گی۔ ان کے سلسلے دراڑ کے دونوں کناروں  
 سے شروع ہو کر درمیان میں مل گئے تھے اور کسی سائبان کی طرح پانی پر چھا گئی تھیں۔ یہ سخت ڈنٹھلوں  
 والی کانٹوں دار جھاڑیاں تھیں۔

”وہ کشتی اس کے نیچے سے گزرتو سکتی ہے۔“ فریدی بڑبڑایا۔ ”خیر چلو۔ آگے بڑھاؤ۔“

لانچ پھر چل پڑی۔ لیکن اب فریدی ہی کی ہدایت پر اس کی ہیڈ لائٹ روشن کر دی گئی تھی۔ اچانک  
 حمید نے پشت پر ایک گونجیلا قہقہہ سنا اور وہ سب ایک تیز قسم کی روشنی میں نہا گئے۔

اُن سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک بڑی کشتی نظر آئی۔ یہ اسی کی ہیڈ لائٹ تھی۔

”تم سب اشین گنوں کی زد پر ہو۔ اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو۔“ انگریزی میں کہا گیا لہجہ غیر ملکیوں کا سا  
 تھا۔ حمید نے فریدی کو ہاتھ اٹھاتے دیکھا۔ روشنی اتنی تیز تھی کہ حمید کی آنکھیں چند ہی لمحوں میں گہری اور اُسے  
 اس روشنی کے علاوہ اور کچھ نہیں دکھائی دیتا تھا۔

”روکنا مت“ فریدی نے آہستہ سے کہا۔ ”جس رفتار سے چل رہی ہے چلتے دو۔ حمید تم ٹرانسمیٹر کو  
 جیر سے بائیں جانب کھسکا دو۔“ حمید نے بڑی پھرتی دکھائی۔

پھر فریدی نے گرج کر کہا۔ ”تم لوگ کون ہو۔“

”ہم لوگ ہتھکڑیوں کے لئے اپنے ہاتھ پیش کرنے آئے ہیں پیارے کرٹل۔“ کشتی سے آواز  
 آئی۔ ”لہذا لانچ روک دو۔“

حمید نیچے جھکا لیکن اس کی اس حرکت کے متعلق کشتی سے کچھ بھی نہ کیا گیا۔

شانددہ فریدی نے بھی اُسے جھکے نہیں دیکھا۔ اب وہ پچھلی نشست کی اوٹ میں تھا۔ اس نے جیب  
 سے ریوالتور نکالا۔ ٹال پچھلی نشست کی پشت گاہ پر رکھی اور ہیڈ لائٹ کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ شیشہ



کچھ دیر بعد سفید کشتی کھلے پانی میں آئی۔ لیکن اب اسے بحری پولیس کا ایک پائلٹ اسٹیز کر رہا تھا۔ دونوں مجرم اب ہوش میں آچکے تھے اور ڈاکٹر ڈریڈ کی لاش فریدی کے قریب پڑی ہوئی تھی۔ فریدی، حمید سے کہہ رہا تھا۔ ”یہ شائد ہماری اسکیم سے واقف ہو گیا تھا۔ لیکن اسے اس کا علم نہیں تھا کہ میرے آدمی جزیرے کے چپے چپے پر موجود ہیں۔“

حمید کچھ نہ بولا۔ وہ حیرت سے ڈاکٹر ڈریڈ کی لاش دیکھ رہا تھا۔ وہ میک اپ میں نہیں تھا کیونکہ شکل انہیں تصاویر سے مشابہ تھی جنہیں وہ بارہا دیکھ چکا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اتنا بڑا مجرم جس سے پورا برا عظم امریکہ کا نپتا تھا ایک حقیر سے چوہے کی طرح ڈوب کر مر گیا۔

”مجھے انفس ہے کہ یہ میرے ہاتھوں سے نہیں مرا۔“ فریدی بولا۔ ”میری چھ ماہ کی محنت برباد ہوگئی۔“ کشتی بحری پولیس کے گھاٹ سے آگئی اور لاش اٹھانے کے لئے اسٹریچر لایا گیا۔ ڈریڈ کے دونوں ساتھیوں کے جھٹکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ یہ دونوں بھی غیر ملکی ہی تھے اور شائد ڈریڈ کے ہمراز بھی تھے ورنہ وہ اس کے ساتھ نہ ہوتے۔

لاش اسٹریچر پر رکھی گئی اور چار قلی اُسے اٹھائے ہوئے کشتی سے اترے۔ فریدی سب سے آخر میں اتر۔ قلی آگے بڑھ گئے تھے اور اب یہ لوگ گرفتار شدگان کے ساتھ چل رہے تھے۔... دفعتاً سنانے میں ایک وحشت ناک قسم کا قہقہہ گونجا اور ساتھ ہی کئی چینی سنائی دیں۔

”ارے.... مار ڈالا.... دوڑو بچاؤ۔“

اور پھر دو قلی بے تحاشہ بھاگتے ہوئے ان لوگوں سے آٹکرائے۔ اُن پر کچھ اس قسم کی بدحوای طاری تھی کہ وہ سنبھالنے کے باوجود بھی اپنے پیروں پر نہ کھڑے رہ سکے اور گرتے ہی بیہوش ہو گئے۔ فریدی اس طرف دوڑا جدھر سے وہ آئے تھے اور اس کے پیچھے بھی دوڑنے لگے.... کچھ دور جا کر وہ رکا۔ یہاں بھی ایک قلی پر دوسرا ڈھیر تھا اور اسٹریچر اُن سے دور پڑا گویا انہیں منہ چڑھا رہا تھا۔

پھر ذرا سی ہی دیر میں پورے علاقے میں بھگدڑ مچ گئی کیونکہ قلیوں کا بیان جنگل کی آگ کی طرح چاروں طرف پھیل گیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ لاش بیک بیک اچھل کر قہقہے لگانے لگی تھی اور پھر انہیں ہوش نہیں کہ اس کے بعد کیا ہوا۔

فریدی اس طرح مضحل نظر آنے لگا تھا جیسے برسوں کا بیمار ہو۔

”آپ خواہ مخواہ فکر کرتے ہیں۔“ حمید بولا۔ ”وہ جتنے حیرت انگیز طور پر ہمارے ہاتھ آیا تھا اتنے ہی اسرار طور پر نکل بھی گیا۔“

”لیکن میں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ڈاکٹر ڈریڈ ہے اُسے اس کے حال پر کیوں چھوڑ دیا تھا۔“ ”تو کیا آپ بھی اسی اسٹریچر پر لیٹ کر سفر کرتے۔ قبر میں بھی اس کے ساتھ جاتے.... جہنم میں جو سکتے۔“

”وہ کبخت جس دم کا بھی ماہر معلوم ہوتا ہے۔“ تقریباً تین چار گھنٹے تک ڈاکٹر ڈریڈ کی تلاش جاری رہی مگر اُس کا سایہ تک نہ مل سکا۔



اور پھر وہ دونوں بولنے پر مجبور ہو گئے۔ وہ حقیقتاً ڈاکٹر ڈریڈ کے راز دار ہی ثابت ہوئے۔ انہوں نے اعتراف کر لیا کہ سیدہ رحمان ڈاکٹر ڈریڈ ہی کے قبضے میں تھی۔ اُن کے بتائے ہوئے پتہ پر پہنچنے کے لئے ایک بار پھر انہیں فن آئی لینڈ کا سفر کرنا پڑا۔ لیکن اس بار اُن کے ساتھ اُن کے محکمے کا آئی جی بھی تھا۔ ڈسٹرکٹ جمنسٹریٹ بھی تھا اور بھی چند بڑے پولیس آفیسرز کی معیت میں وہ وہاں پہنچے۔ سیدہ رحمان برآمد کر لی گئی۔

وہ بہت اچھی حالت میں تھی اُس نے انہیں بتایا کہ اُسے کسی قسم کی تکلیف نہیں دی گئی تھی۔

”کنٹرل! تمہارا یہ کارنامہ بھی ہمیشہ یاد رہے گا۔“ آئی جی نے فریدی کا شانہ تھپتے ہوئے کہا۔

”مجھے شرمندہ نہ کیجئے۔ ڈریڈ تو نکل ہی گیا۔“ فریدی نے جواب دیا۔

”یہی کیا کم ہے کہ تم نے شہر کی ایک معزز خاتون کو اُس کے بچے سے رہائی دلوائی۔“

”معزز....!“ فریدی مسکرا کر رہ گیا۔ لیکن اس کے لہجے نے آئی جی کو اُسے گھورنے پر مجبور کر دیا۔

”کیا مطلب....!“

”جناب والا۔ ذرا یہ تو خیال فرمائیے کہ ڈاکٹر ڈریڈ کو اس انواء سے کیا فائدہ پہنچتا۔“

”جو کچھ ایک مالدار خاتون کے انواء سے کسی کو پہنچ سکتا ہے۔“

”مالدار....!“ فریدی پھر اُسی انداز میں مسکرایا۔ ”اس بچاری کی آمدنی تین ہزار روپیہ سالانہ سے

زیادہ نہیں ہے۔ یعنی ڈھائی سو روپے ماہوار جو یہ اپنی ملازمت سے حاصل کرتی ہے۔“

”نہیں....!“ آئی جی کے لہجے میں حیرت تھی۔ ”پھر وہ جیسا والا قصہ۔“

”اسکیڈل.... فراڈ....“ فریدی آہستہ سے بولا۔ ”ڈاکٹر ڈریڈ نے میں ہزار کا خون کر کے لاکھوں بنانے کی اسکیم تیار کی تھی... لیکن چوٹ کھا گیا۔“

”میں نہیں سمجھا۔“ آئی جی کی حیرت لفظ بہ لفظ بڑھتی جا رہی تھی۔

”اس نے پہلے سعیدہ کے متعلق ساری معلومات بہم پہنچائی اور پھر جیکا کے فراڈ سے رابطہ قائم کر کے اُس سے اُس کے نام یہاں کے ایک بینک میں تیس ہزار منتقل کرائے اور اُسی فراڈ نے جیکا سے سعیدہ کے وکیل کی معرفت اُسے ایک بڑے آدمی کے وارث ہونے کی خوشخبری پہنچائی۔ سیرسٹر کیلاش درما ایک اچھے آدمی ہیں انہوں نے سعیدہ کو اپنے بچوں کی طرح پالا تھا لہذا وہ بھی دھوکہ کھا گئے.... اور شہر کیا سارے ملک میں سعیدہ کے اچانک مالدار ہوجانے کی پہلشی ہو گئی۔ شہر کے بڑے آدمی اس کے گرد منڈلانے لگے۔ ڈاکٹر ڈریڈ بھی چاہتا تھا۔ جب اُس خواستگاروں کی فہرست خاصی طویل ہو گئی تو ڈاکٹر ڈریڈ نے اُسے آرکچو سے اٹھوایا۔ اگر اُس دن قاسم کی ذات سے کوئی ہنگامہ نہ کھڑا ہوتا تب بھی وہ کسی نہ کسی طرح وہاں سے اٹھوا لی جاتی۔“

”لیکن مقصد....!“ آئی جی مضطربانہ انداز میں بڑبڑایا.... اور فریدی اس سلسلے کے بعض واقعات کو دہراتا ہوا بولا۔ ”میں اُسی وقت کھٹک گیا تھا جب مجھے اطلاع ملی تھی کہ ایک آدمی پولیس آفسر کے بھیس میں سعیدہ کے مکان سے وہ وزیٹنگ کارڈ جھٹک لے گیا جو اُس نے اکٹھا کئے تھے۔ اگر اس سے یہ حماقت سرزد نہ ہوتی تو شاید میں ابھی تک اندھیرے ہی میں بھٹکتا ہوتا۔ بہر حال وہ کارڈ اسی لئے اڑا لئے گئے تھے کہ پولیس اس کے ملنے جلنے والوں کی شخصیتوں سے لاعلم رہے۔“

”مگر کیوں....!“ آئی جی نے بے چینی سے کہا۔ ”اصل بات بتاؤ۔“

”اصل بات یہ ہے کہ وہ اس کے خواستگاروں سے لمبی لمبی رقیس وصول کرنا چاہتا تھا۔ یقین کیجئے کہ اُس نے اس معصوم لڑکی پر جو تیس ہزار روپے خرچ کئے تھے ان سے کم از کم کروڑ بتی ضرور ہوجانا۔ اس کی لسٹ پر تیس آدمی تھے۔ آج میں نے اُس کے جو دو عدد خطوط شہر کے دو بڑے آدمیوں سے حاصل کئے ان میں اس نے ہر ایک سے چار چار لاکھ کا مطالبہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ سعیدہ کو صرف آپ ہی کی ذات سے اس کی توقع ہے کہ اُس کی رہائی کے لئے چار لاکھ خرچ کر دیں گے۔ لیکن اگر اس کی اطلاع پولیس کو دی گئی تو آپ چالیس لاکھ میں بھی سعیدہ کو نہ حاصل کر سکیں گے اور وہ مار ڈالی جائے گی۔ مجھے یقین ہے کہ اُن تیسوں آدمیوں کو اسی قسم کے خطوط لکھے گئے ہوں گے۔ اب آپ خیال

فرمائیے۔ ان میں سے ہر ایک یہی سوچ رہا ہوگا کہ وہ سعیدہ کا دل جیتنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ تبھی تو اس نے خصوصیت سے اُسی کی ذات سے یہ توقع ظاہر کی ہے کہ وہ اُس کے لئے چار لاکھ خرچ کر دے گا.... پھر چار کیا.... وہ ایک ارب پتی لڑکی کے لئے چالیس لاکھ بھی خرچ کر سکتے ہیں۔“

”میرے خدا....!“ آئی جی پیشانی رگڑتا ہوا بولا۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو۔“

سعیدہ وہاں موجود تھی اور بہت بُرا سامنہ بنائے ہوئے فریدی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے ہی فریدی خاموش ہوا اُس نے کہا۔ ”مگر میرے چچا کا کرم رحمان ہی نام تھا.... اور وہ بچپن ہی سے....!“

”نہی بچی....!“ فریدی مغموں لہجے میں بولا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ تمہارے ہوائی قلعے سمار ہو گئے۔ پچھلے سو سال سے جیکا میں کرم رحمان نام کا کوئی بڑا آدمی نہیں گزرا۔ ڈاکٹر ڈریڈ نے یہ تیس ہزار روپے اسی لئے صرف کئے تھے کہ پولیس بھی دھوکا کھا جائے اور جیکا سے تحقیقات کرنے کی زحمت نہ گوارا کرے۔ میں بھی قطعی نہ کرتا.... مگر.... وہ وزیٹنگ کارڈ.... اسی جگہ ڈاکٹر ڈریڈ جیسا چالاک آدمی چوک گیا تھا.... اگر اُسے وزیٹنگ کارڈ حاصل ہی کرنے تھے تو کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرتا.... لیکن وہ پولیس آفسر والا فراڈ.... فراڈ نہیں بلکہ ایک بچکانہ حرکت تھی۔“

”مگر پھر.... یہ قاسم اور پرویز کا کیا جھگڑا تھا۔“ آئی جی نے پوچھا۔

”وہ میری ہی ذات سے بڑھا تھا اور اس لئے بڑھا تھا کہ ڈاکٹر ڈریڈ کو دھوکے میں رکھنا مقصود تھا۔ وہ یہی سمجھتا رہا کہ پولیس انہیں دونوں میں سے کسی پر شک کر رہی ہے۔ اس طرح وہ بے احتیاط بھی ہوگی اور میں اس کے گرد اپنا جال بٹاتا رہا۔ ڈریڈ نے اُن دونوں بڑے آدمیوں کو بھی لکھا تھا کہ وہ قاسم اور پرویز کے معاملے سے تذبذب میں نہ پڑیں۔ وہ معاملہ تو محض پولیس کا دھیان اُدھر بنادینے کے لئے کھڑا کیا گیا ہے۔“

آئی جی سعیدہ کو بہت حقارت سے دیکھ رہا تھا۔ اب شاید وہ شہر کی ایک معزز خاتون نہیں رہی تھی۔ اب شاید وہ اس قابل بھی نہیں تھی کہ کوئی اس سے اتنا ہی پوچھ لیتا کہ تمہیں گھر تک پیدل تو نہ جانا پڑے گا۔ لیکن اب سے ایک گھنٹہ قبل اس کے لئے تجوروں کے منہ کھلے ہوئے تھے۔

اس وقت وہ بھی ایک لاش ہی معلوم ہو رہی تھی لیکن اُس لاش میں قہقہہ لگانے کی سکت نہیں تھی۔